جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر حسن الدین احمد
آئی اے ایس (ریٹائرڈ)

جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر حسن الدین احمد

آئی اے ایس (ریٹائرڈ)

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات ع۱۱

پہلی بار : ۱۹۸۸ء

طباعت : سرور پرنٹنگ پریس۔ لکڑی کاپل۔ حیدرآباد

سرورق : غوث محمد

طباعت سرورق : انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ

ناشر : ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

قیمت :۔ پندرہ ۱۵ روپے

:۔ ملنے کے پتے :۔

- ادبی ٹرسٹ ۔ روزنامہ سیاست

جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد ع۱

- حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد ع۲

ترتیب

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے ۱۹۶۶ء سے اپنی اشاعتی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حیدرآباد سے اردو کتابوں کی اشاعت بڑا مشکل بلکہ ناممکن کام تھا۔ کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ادبی ٹرسٹ نے کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا آغاز کیا۔ اس کا اپنا ایک بک ڈپو بھی تھی جو اردو اکیڈیمی میں ضم ہونے کے بعد افسوس ہیکہ ختم ہوگیا۔

دو دہے کے اس عرصہ میں ادبی ٹرسٹ نے دس کتابیں شائع کیں جن میں مخدوم محی الدین کے مجموعہ کلام بساطِ رقص کا دوسرا ایڈیشن بھی شامل ہے۔ اور تا حال تقریباً ۲۴ کتابوں کی اشاعت کیلئے امداد بھی دی۔ ٹرسٹ نے اب حیدرآباد کی تاریخ و تہذیب کے موضوع پر اردو میں کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ شہر حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے موضوع پر مسودات طلب کئے گئے لیکن افسوس ہیکہ شہر حیدرآباد پر کوئی مبسوط مسودہ وصول نہیں ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے موضوع پر ڈاکٹر حسن الدین احمد کا مسودہ شائع کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ مسرت محسوس کرتا ہے جامعہ عثمانیہ پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جسے دستاویزی حیثیت بھی حاصل ہے۔ ٹرسٹ نے اس میں گوشۂ عثمانیہ کے باب کا اضافہ کیا ہے جو جامعہ عثمانیہ میں حالیہ ایک اہم اضافہ ہے۔

ٹرسٹ کی یہ کوشش ہیکہ شہر حیدرآباد کے بعض اہم موضوعات پر ماہرین سے مضامین اور کتب مرتب اور شائع کروائے تاکہ حیدرآباد کی تاریخ، تہذیب اور روایات سے متعلق مواد محفوظ رہے اور نئی نسل اس سے استفادہ کرسکے۔

مجھے یقین ہیکہ ادبی ٹرسٹ کے اس مشن میں قارئین کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔

محامد علی عباسی، صدر ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد

[سوماجی گوڑہ]

انقلاب سے دو چار ہونے سے پہلے حیدرآباد تین چار صدیوں سے علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اُردو اور فارسی زبانوں کے سینکڑوں بلند پایہ ادیب و باکمال شاعر اس شہر میں پیدا ہوئے یا باہر سے آکر اس میں کچھ اس طرح رچ بس گئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ شہر حیدرآباد کی بنا ایک ایسے شخص محمد قلی قطب شاہ نے ڈالی تھی جو خود ایک بہت بڑا شاعر تھا اور تین زبانوں فارسی، اُردو اور تلنگی میں اعلیٰ پایہ کا کلام لکھتا تھا۔ جن لوگوں نے اس شہر کو آباد کیا اور گولکنڈہ اور اس کے قرب و جوار سے آکر یہاں بس گئے۔ وہ خود شعر و سخن اور علم و ادب کے اعلیٰ ذوق سے متصف تھے۔ اس طرح یہ شہر ابتدا ہی سے اُردو کا اہم مرکز رہا ہے اور آغاز تعمیر سے اب تک اس کے در و دیوار اُردو زبان کے نغموں سے گونجتے رہے ہیں۔

لیکن اب یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آرہا ہے۔ جدید سیاسی نظریوں نے ہر جگہ ہر چیز کی قیمت کو متاثر کیا ہے۔ حیدرآباد کے حالیہ انقلاب کے بعد اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ حیدرآباد کی ایک ایک اینٹ اُردو کے خمیر سے گھڑی ہوئی ہے اور مسلسل توڑ پھوڑ کے باوجود اس شہر کی بعض اہم قطب شاہی عمارتیں منہدم نہ ہو سکیں۔ اسی طرح یقین ہے کہ حیدرآباد میں اُردو کے رواج و مقبولیت کی عمارت بھی زمین دوز نہ ہو سکے گی۔

تاہم موجودہ صورت حال کے پیش نظر جبکہ اُردو کا اثر و نفوذ کم ہوتا جا رہا ہے، حیدرآباد کے دلدادگان اُردو پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اُردو کے تعلق سے حیدرآباد کے کارہائے نمایاں کو محفوظ کر لیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی نسل یہ معلوم کر سکے یہ جان سکے کہ حیدرآباد کی تاریخ اُردو کیسے کیسے علمی و ادبی کارناموں سے معمور رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ان ہی کارناموں میں سے ایک ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حیدرآباد کا تعلیمی پس منظر

زمانۂ سابق میں تعلیم کا قدیم ترین محرک ہر جگہ مذہب رہا ہے۔ پیشوایانِ مذہب اولین معلم ہوتے تھے اور عبادت گاہیں عموماً مکتب کا کام دیتی تھیں۔ یہ زیادہ تر ابتدائی نوشت و خواند کے مدرسے ہوتے تھے جن کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ طالب علموں میں مذہبی احکام سمجھنے کی بقدرِ ضرورت صلاحیت پیدا ہو جائے۔ پنڈتوں اور ملاّ صاحبوں کے خانگی مدارس کے علاوہ بعض تعلیم گاہیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کی سرپرستی عوام یا امراء کرتے تھے۔ حکومت یا امراء کے قائم کردہ مدارس کا پتہ اسلامی حکومتِ دکن کے ابتدائی دور سے چلتا ہے۔ ایک وقائع نگار ولمٹ اسی زمانے کے متعلق لکھتا ہے۔

"ان مدرسوں اور کالجوں میں جن میں اکثر سلاطین بہمنیہ کے قائم کردہ تھے یا ان کی امداد سے چلتے تھے۔ طلبا کی رہائش کا بھی انتظام تھا اور ان کے کھانے پینے اور لباس کے اخراجات سب کچھ حکومت برداشت کرتی تھی۔ ممالک محروسہ میں قدیم ترین نظامِ تعلیم جو رائج تھا عموماً بہت سیدھا سادہ اور اس زمانے کی ضرورت کے مطابق تھا" [1]

یہ حقیقت ہے کہ دکن میں اسلامی طریقۂ تعلیم کی ابتداء بہمنیہ سلاطین کے زمانے سے ہوئی۔ حکومت اور امراء کی سرپرستی میں مدارس قائم ہوئے۔ ان میں قابلِ ذکر "مدرسۂ محمودیہ" ہے جس کا بانی سلطان محمد ثالث (۱۴۶۳ء۔ ۱۴۸۲ء) کا علم دوست وزیر محمود گاواں تھا۔ یہ مدرسہ شہر بیدر میں قائم کیا گیا تھا جو بہمنیوں کا آخری پایۂ تخت تھا۔ اس مدرسہ کی

---

[1] ۔ ہسٹاریکل اینڈ ڈسکرپٹیو اسکیچ آف نظامس ڈومنین صفحہ ۲۰۵

عمارت جس کے آثار آج بھی اس کی قدیم عظمت کا پتہ دیتے ہیں، تین منزلہ تھی اور کئی وسیع کمروں اور دالانوں پر مشتمل تھی۔ یہ عمارت طلبہ اور اساتذہ کے قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔ اطراف ہند کے بہترین علماء یہاں درس دینے کے لئے جمع کئے گئے تھے۔ تشنگان علم کے لئے اس کی حیثیت ایک سرچشمہ کی تھی۔ سلطنت بہمنیہ کے بعد اگرچہ دکن کی تعلیمی مرکزیت ختم ہو گئی تاہم بیدر کی بریدشاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے علم و ادب کی سرپرستی کی۔

قطب شاہی عہد کے بہت سے ایسے مدارس کا آج بھی پتہ چلتا ہے جو درگاہوں، خانقاہوں اور مسجدوں سے متعلق تھے۔ حیدرآباد کی جامع مسجد میں ایک بڑا مدرسہ قائم تھا جو اس کے بانی حافظ شجاع الدین کے نام پر "مدرسہ شجاعیہ" کہلاتا تھا۔ اس مدرسہ کی تعمیر مسجد کے ساتھ سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ۔ ۱۰۲۰ھ) کے عہد میں ہوئی تھی۔ تعلیم کے علاوہ طلباء اور اساتذہ کے رہنے کے لئے اس میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے یہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ موقوف رہا، لیکن آصفجاہی دور میں نواب شمس الامراء کی توجہ سے اس نے بہت ترقی کی۔

سلاطین قطب شاہی کے بعد ۱۷۲۴ء میں مملکت آصفیہ کا قیام عمل میں آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آصفی خاندان کے اولین تاجداروں کی تمام تر توجہ بیرونی جنگوں کے سرانجام اور اندرونی نظم ونسق کی درستی میں الجھی رہی لیکن ان کے دماغ ملک کی تعلیمی ضرورت کے خیال سے خالی نہ تھے۔ اورنگ آباد میں آصف جاہ اول کے قائم کئے ہوئے "مدرسہ فاروقیہ" کا نام آج تک باقی ہے۔ ناصر الدولہ کے عہد میں ریاست کے تعلیمی نظام کی جدید تنظیم ہوئی۔ اس دور کی ناقابل فراموش درسگاہ کا نام "مدرسہ فخریہ" ہے۔ اس کے بانی حیدرآباد کے مشہور عالم فاضل فخر الدین خاں (نواب شمس الامراء ثانی) ہیں۔ نواب صاحب موصوف کو عقلی اور حکمی علوم اور ترقی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے اطراف علما کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا۔ اس علمی شغف کے باعث ۱۸۴۳ء میں اپنی دیوڑھی واقع شاہ گنج میں ایک مدرسہ علوم نقلیہ اور عقلیہ کی تعلیم کے لئے قائم کیا۔ اس میں ملک کے مستند علما تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ اس زمانے میں یہ مدرسہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا واحد مدرسہ تھا جہاں متداولہ علوم دینی کے ساتھ حکمی اور عملی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اردو میں

ان علوم کی کتابیں موجود نہ ہونے سے خود بانیٔ مدرسہ کتابیں تصنیف کرتے اور دوسرے علما سے لکھواتے تھے۔ [۱]

اُردو میں مغربی علوم بالخصوص سائنس و ریاضی کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ شمس الامراء کو چونکہ علوم ریاضی و ہیئت سے خاص لگاؤ تھا اس لئے زیادہ تر ان ہی علوم سے متعلق کتابیں فرانسیسی اور انگریزی سے اُردو میں منتقل ہوئیں۔ نواب موصوف نے ہیئت کی عملی تعلیم اور اجرام فلکی کے مشاہدات کے لئے جہاں نما کی عمارتیں بھی تعمیر کروائی تھیں۔ رصدگاہ نظامیہ کی بنیاد بھی ان ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ تاریخ خورشید جاہی کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ "مدرسۂ فخریہ" کے علاوہ چند اور درسگاہیں بھی قائم تھیں جنھیں ان کے جانشین امراء نے بھی جاری رکھنے کی کوشش کی۔

نواب ناصر الدولہ بہادر کے عہد (۱۸۲۷ء۔ ۱۸۵۶ء) تک برطانوی ہند میں تعلیم کا کافی چرچا ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہاں کی تعلیمی تحریکات سے حیدرآباد کیسے غیر متاثر رہ سکتا تھا۔ ناصر الدولہ کے دورِ حکومت کے آخری زمانہ میں حیدرآباد میں تعلیم کی منظم کوششیں شروع ہوئیں اور سب سے پہلے دار السلطنت میں مدرسۂ طبابت قائم کیا گیا۔ (۱۸۴۵ء)۔ اس مدرسہ میں ڈاکٹری کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ طبابت عرصۂ دراز تک قائم رہا اور یہاں سے نواب لقمان الدولہ، ارسطو یار جنگ جیسے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

جب قلمدانِ وزارت سالار جنگ کے تفویض ہوا اور وہ ۱۸۵۳ء میں ریاست دکن کی صدر المہامیٔ عظمیٰ پر متمکن ہوئے تو انھیں ملک کی تعلیمی پستی کا احساس ہوا۔ چنانچہ مدار المہامی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہونے کے دوسرے ہی سال پائے تخت میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو "مدرسہ دار العلوم" کے نام سے موسوم ہوا اور نصف صدی سے زائد تک ملک میں علم کی روشنی پھیلاتا رہا۔ نواب صاحب کے مکان ہی میں اس درسگاہ کا افتتاح ہوا (۱۸۵۶ء)۔ "دار العلوم" کا قیام حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں منظم تعلیم کا پہلا اور مستقل قدم ہے۔ اس درسگاہ نے اپنے

---

[۱] - محمد امیر اللہ فاروقی۔ مناقب شجاعیہ ص ۵۸، ۵۹

قیام کے دو تین سال کے اندر اہمیت حاصل کرلی۔ مدرسہ کا اولین نظام تعلیم "درس نظامیہ" کے نام سے موسوم تھا لیکن یہاں انگریزی کے ساتھ مقامی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ البتہ مقامی اور انگریزی کی شاخیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ تعلیم کا ذریعہ اردو زبان تھی۔ اس مشرقی درسگاہ کے ارتقاء میں حیدرآباد کے آئندہ تعلیمی ترقی کا راز مضمر تھا۔ دارالعلوم کے احسانات آج تک ملک کی علمی فضا پر باقی ہیں جس نے نہ صرف ملک کو اعلیٰ عہدیدار دیئے بلکہ حیدرآباد کی شائستگی کو بنانے میں اہم حصہ لیا۔ اس کے فارغ التحصیل افراد نظم ونسق کے ہر شعبہ میں چھائے ہوئے تھے۔ اس ادارہ کے نقش قدم پر حیدرآباد میں اور بہت سے ادارے اور تعلیمی مراکز قائم ہوئے۔

تعلیم کا شوق جب عام ہونے لگا تو ۱۸۶۰ء میں ایک گشتی نافذ ہوئی جس کی رو سے ہر تعلقہ میں دو دو مدرسے کھولے جانے شروع ہوئے۔ ان مدارس میں ایک مدرسہ فارسی اور دوسرا مقامی زبان کا ہوتا تھا لیکن چونکہ دفتری اور سرکاری زبان اب تک رسمًا فارسی تھی اس لئے لوگ عمومًا اپنے بچوں کو فارسی مدارس میں بھیجنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشرقی تعلیم کے دوش بدوش انگریزی تعلیم بھی ملک میں بارآور ہورہی تھی چنانچہ مدرسہ فوقانیہ چادرگھاٹ میں کالج کی کلاسیں کھولی گئیں۔ بعدازاں اس کا تعلق مدرسۂ فوقانیہ سے منقطع کرکے مدرسۂ عالیہ کے ساتھ وابستہ کردیا گیا۔ بعد میں یہی نظام کالج کے نام سے موسوم ہوا۔ ملک میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کا یہی ایک مرکز تھا۔ جامعہ مدراس سے ملحق ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ نتائج بھی مایوس کن تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۹ء تک عام تعلیم کی تنظیم اور اس کے دائرہ کو مزید وسعت دینے کی کوششیں جاری رہیں۔

میر محبوب علی خاں آصف سادس کے دورِ حکومت میں ریاست کی عدالتی اور حکومتی زبان فارسی تھی۔ تمام فیصلے اور ہر قسم کی سرکاری مراسلت اسی زبان میں ہوتی تھی اس کے ساتھ تلنگی اور مرہٹی کا بھی دور دورہ تھا۔ بعض دفاتر اسی زبانوں میں تھے اور افسران اعلیٰ کو جو ان زبانوں سے واقف نہ تھے بڑی مشکلات پیش آتی تھیں اور اس دوعملی سے دفتری مشکلات ہی نہیں بلکہ حصول انصاف اور معاملات کے تصفیہ میں صیانت حقوق کا سوال

خطرہ میں پڑ رہا تھا۔ اس لئے تمام دفاتر میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے فارسی کے بجائے ۱۸۸۴ء میں سرکاری زبان اُردو قرار دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی وہ تمام اصطلاحیں جو بالعموم فارسی اور بعض انگریزی میں مستعمل تھیں اب اُردو میں منتقل ہونے لگیں۔ اس سے تعلیمی فضا کو ہموار کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اُردو کی اہمیت بڑھ گئی اور اُردو رفتہ رفتہ ترقی کے مدارج طے کرنے لگی۔

ملک کی تعلیمی کوششوں کو آگے بڑھانے میں حکومت نے داخلی اُمور کے ایک صدرالمہام کا تقرر کر کے تعلیمی مسائل ان کے تفویض کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمات کے کاروبار کی نگرانی کے لئے ایک عہدہ دار سلطنت مسٹر ولکنسن کو مہتمم تعلیمات بنایا گیا جنھوں نے تعلیمی اصلاحات کے علاوہ ایک مدرسہ تعلیم المعلمین کا خاکہ مرتب کیا اور چادر گھاٹ میں ایک مدرسہ فوقانیہ انگریزی قائم کیا۔ اس طرح حدود بلدہ میں مدرسۂ دارالعلوم اپنی چھ شاخوں کے ساتھ قائم تھا۔

مدرسۂ قرآن شریف — مدرسۂ فوقانیہ عربی — مدرسۂ فوقانیہ فارسی
مدرسۂ زبانِ مقامی ۲؎ — مدرسۂ زبانِ مقامی ۲؎ — مدرسۂ فوقانیہ انگریزی

اطراف بلدہ میں حسب ذیل مدارس تھے۔

محبوب کالج سکندرآباد — محمڈن کالج — گرلس پاٹھ شالہ — گرام اسکول بلارم
گرلس اسکول بلارم — سینٹ جارجس گرام اسکول — مدرسۂ عالیہ
رومن کیتھولک مشن اسکول۔

مدرسۂ عالیہ امراء کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا۔ سب سے پہلے سالار جنگ بہادر کی دیوڑھی میں خانگی جماعت کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد میں باقاعدہ مدرسہ کی صورت میں تبدیل ہوا۔ اس مدرسہ کے دو شعبے تھے۔ ایک مشرقی دوسرا انگریزی۔ ہر طالب علم کو دونوں شعبوں کے مضامین پڑھنے پڑتے تھے۔ حیدرآباد کے اکثر امراء اسی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ابتدائی دور میں تو اس مدرسہ میں داخلہ شاہی فرمان کے ذریعہ ہوتا تھا۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں نواب عمادالملک ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ ان کی قیادت میں محکمۂ تعلیم نے غیر معمولی ترقی کی۔ حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ۱۸۷۸ء اس لئے اہم ہے کہ اس سال حیدرآباد میں اعلیٰ مغربی تعلیم کی درس گاہ "حیدرآباد کالج" کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں نظام کالج

کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا اسی سال سے ملک میں اعلیٰ انگریزی تعلیم کی بنیاد پڑی۔ یوں تو انگریزی تعلیم کی بنا ۱۹ ویں صدی کے ربع اول سے پڑ چکی تھی، لیکن عام انگریزی تعلیم کا آغاز قیام دارالعلوم کے سال ۱۸۵۶ء سے شمار ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے پہلے انگریزی صرف مشنری مدارس تک محدود تھی۔

"دارالعلوم" کے جامعہ پنجاب سے بے تعلق ہو جانے سے اعلیٰ تعلیم کی راہ جو مسدود ہوتی نظر آرہی تھی اس نے جامعۂ حیدرآباد یا نظام یونیورسٹی کے خیال کو از سر نو تازہ کیا۔ ایسی تعلیمی فضا کے ساتھ عہد عثمانی کی ابتداء ہوئی اور اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی کے بعد ہی یعنی ۱۹۱۱ء سے مروجہ نظام تعلیم کی اصلاحی کوششوں کو پر پرواز ملا۔ اس مقصد کیلئے دو ماہران تعلیم مقرر کئے گئے۔ ایک مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے مسٹر آرتھر مے ہیو۔ شبلی ایک عالم اور مصنف کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ علی گڑھ میں ایک عرصہ تک پروفیسر رہ چکے تھے۔ تعلیم و تدریس کا بھی اچھا تجربہ تھا۔ تعلیمی امور و مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک روشن خیال عالم تھے۔ مغربی خیالات سے نابلد نہیں تھے۔ آرتھر مے ہیو بھی بحیثیت ماہر تعلیم بڑی مقبولیت و شہرت کے حامل تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کی تعلیم کے لئے بڑی مفید خدمات انجام دیں۔ اپنے تجربوں سے ایک صحت بخش نظام تعلیم ملک کے لئے مرتب کیا۔ ان کی سفارشات (۱۹۱۲ء) میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی سطح تک مادری زبان میں ہونے پر زور دیا گیا تھا۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے برطانوی ہند کے شہرۂ آفاق، ماہر تعلیم ڈاکٹر الماطیفی کی خدمات مستعار لی گئیں (۱۹۱۲ء)۔

اس تنظیم کا ایک فوری فائدہ یہ ہوا کہ تحتانی اور فوقانی تعلیم کی حالت اطمینان بخش ہوگئی لیکن اعلیٰ تعلیم بدستور تنزل پذیر رہی۔ اصلاح اور اشاعتِ تعلیم کے مقصد سے کئی انجمنیں قائم کی گئیں جن میں "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر لطیفی کی جگہ سید راس مسعود نے لی جو اس خدمت کو ۸ سال تک انجام دیتے رہے۔ ان ہی کے زمانے میں جامعہ عثمانیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

اُردو یونیورسٹی کا تخیّل

نہ معلوم وہ لوگ کیسے ہوں گے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ جب اس کی تشکیل ہوئی تو صدیوں پرانی اس غلط فہمی اور احساسِ کمتری کا خاتمہ ہوگیا کہ درس و تدریس قومی زبان کے ذریعہ ممکن نہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے تخیّل میں کئی شخصیتوں کا ہاتھ ہے اور یہ تخیل دورِ عثمانی سے بہت قبل واضح طور پر پیش ہوچکا تھا۔ دورِ عثمانی کا آغاز ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس ۱۹۱۸ء میں عمل میں آئی۔ اس لئے یہ سمجھنا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صرف ۷ سال کی قلیل مدت میں اس انقلاب آفریں تخیّل کا نشوونما ہوا اور صورت گری بھی ہوئی درست نہ ہوگا۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

> "جامعہ عثمانیہ کوئی پیدا کی ہوئی چیز نہیں بلکہ ملک کے گزشتہ تعلیمی حالات کی بتدریج ارتقا یافتہ شکل ہے ......
> مفکرینِ ملک کے ذہن میں حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کا خیال اور اس جامعہ کے اجزائے ترکیبی کا دھندلا سا تصور اس میں شک نہیں کہ عرصہ پہلے پیدا ہوچکا تھا۔" [۱]

جامعہ کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی کے آخری دو اور بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں کے حیدرآبادیوں کے دلوں جذبات، احساسات اور امنگوں کو سمجھنا ہوگا اور ان عظیم شخصیتوں کی زندگیوں اور ان کے خیالات کا مطالعہ کرنا ہوگا جنھوں نے حیدرآباد کے لئے ایک

---

[۱] ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی ۱۹۳۴ء ص

عملی جامعہ کا خواب دیکھا اور قیام جامعہ کا مطالبہ کیا اور اس کی فضا کو ہموار کیا۔

"وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے کاموں
کو جو یاد رکھنے کے قابل ہیں بھلا دے۔" [1]

ایسے دور میں جبکہ حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں غیر معمولی خلفشار تھا۔ چند اولوالعزم شخصیتوں نے سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لینے کی بجائے تعمیری نقطۂ نظر اختیار کیا۔ اور قیام جامعہ کی تعمیری اور مثبت تحریک چلائی۔ یہ لوگ سچائی، درد اور استقلال سے اپنا کام کئے جا رہے تھے۔ ان کی پیہم کوششوں سے چند ہمدرد بالآخر باہم مجتمع ہو گئے۔

۱۸۸۳ء میں حیدرآباد کے وزیر باتدبیر سر سالار جنگ اول کا انتقال ہوا تو اس وقت نظام حیدرآباد نواب میر محبوب علی خاں کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ حیدرآباد کے لئے یہ بڑا سخت دور تھا۔ اکرام اللہ خاں ندوی "وقارِ حیات" میں لکھتے ہیں:

"حیدرآباد کا یہ زمانہ بھی ایک خاص زمانہ تھا جبکہ یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے پولٹیکل شاطر وہاں موجود تھے اور ہر شخص اپنے مخصوص اغراض کے مطابق جوڑ توڑ اور سازش میں مصروف تھا۔"

سرور الملک "کارنامۂ سروری" میں لکھتے ہیں۔

"اس وقت تک (نواب میر محبوب علی خاں کے سفر دہلی تک) اعلیٰ عہدوں پر زیر نگرانی امراؤ زادگاں اکثر حضرات مدراس مقرر و ممتاز تھے۔ یہ سب حضرات سیدھے سچے، باوفا اور بہی خواہ اپنے سرکار کے تھے۔ کبھی ان کے ذہن میں اپنے دائرہ سے قدم آگے بڑھانا یا خیر خواہی کے پردے میں اس سے ذاتی منافع حاصل کرنے کی بات نہیں آتی تھی مگر اب انتظام ملک کے دفاتر اور محکمہ جات میں شمالی ہند کے حضرات بھی بیشتر بسفارش سر سید احمد خاں آنے لگے۔ (سر سالار جنگ کے بعد

---

[1] سر سید احمد خاں۔ علامہ شبلی کی تالیف المامون کا مقدمہ

کل شمالی ہندوستان کے حضرات ایک گروہ عظیم تجربہ کار ......
ایسے کہ موقع خود نہ آئے تو موقع کو گھسیٹ لائیں یک دل و یک جہت
ہوکر .... وہ چند حضرات جو ...... بنگال سے طلب کئے گئے
تھے (دلیل الدین احترام جنگ اور مولوی عبدالکریم میر مجلس عدالت العالیہ)
ان کی عمروں نے وفا نہ کی۔"

امیر کبیر نواب محمد فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی (۱۷۸۰ء تا ۱۸۶۳ء) نے جو راستہ ہموار کیا تھا اس پر چل کر خاندان نوائط کے ممتاز افراد، مولوی عبدالقادر (نصیر الدین ہاشمی کے والد) محمد مرتضیٰ مولانا صفی الدین مددگار صیغۂ تعلیمات، حسین لطف اللہ وغیرہ نے زور وشور سے قیام جامعہ کا مطالبہ کیا اور اس سلسلے میں موثر آواز بلند کی۔ محمد مرتضیٰ نے اس مطالبہ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا اور اس سلسلے میں انھوں نے کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا۔ قیام جامعہ کے سلسلہ میں انھوں نے جو جد وجہد کی اس کے نتیجہ کے طور پر عوامی حلقوں میں اور حکومتی سطح پر حیدرآباد کے لئے ایک علٰحدہ یونیورسٹی کا احساس پیدا ہوا۔ اس احساس کو پیدا کرنے میں رسالہ صحیفہ نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ [1]

ہندوستان میں انگریزی حکومت کا قیام مستحکم ہوا تو مسلمانوں نے بدیسی حکومت سے بیزاری اور نفرت کا اظہار زبان انگریزی کی مخالفت کی صورت میں کیا۔ سرسید نے اس رویہ کے نقصانات کو شدت کے ساتھ محسوس کرکے انگریزی تعلیم کی زبردست حمایت کی تاکہ مسلمان انگریزی حکمرانوں کے ساتھ بیٹھنے کے قابل بنیں۔

حیدرآباد میں صورت حال مختلف تھی۔ یہاں اقتدار مسلمان حکمران اور امراء کے ایک طبقہ کو حاصل تھا جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شامل تھے۔ ریزیڈنسی کی مداخلت

---

[1] رضی الدین حسن کیفی نے انجمن معارف کے زیر نگرانی ماہوار رسالہ جاری کیا۔ ملا عبدالقیوم کے انتقال کی وجہ سے انجمن کو اور صحیفہ کو ابتداء کے فوری بعد روز بد دیکھنا پڑا۔ بعد میں مولوی اکبر علی اس کے ایڈیٹر بنے۔ چند سال بعد اس رسالہ نے روزنامہ کی صورت اختیار کی۔ یہ روزنامہ شام کو شائع ہوتا تھا۔

کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ انگریز بھی حکمرانی میں شریک تھے۔ یہاں کے حالات کے پیش نظر یہاں نہ تو انگریز کی ہم نشینی ضروری تھی اور نہ ہی ہم نشینی کی اہلیت پیدا کرنے کے لیئے انگریزی زبان ناگزیر۔ ان حالات میں یہاں سرسید کی تحریک کا راست اثر نہیں پڑا بلکہ اہل فکر طبقہ نے مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع پیدا کرنے کے خواب دیکھے۔ اس خواب کے لیے حیدرآباد میں ماحول سازگار تھا۔ حیدرآباد کی سرگرمیوں میں اُردو زبان کا تقریباً ایک سو پچاس سال کا ساتھ ہے۔ اس کی ابتداء سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں جامع مسجد کے مدرسہ کے قیام سے ہوتی ہے جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے۔

اس پس منظر میں اُردو یونیورسٹی کے تخیل کی پہلی تحریک قیام جامعہ عثمانیہ سے ۴۵ سال قبل کی گئی۔ اس کے محرک شیخ احمد حسین خاں رفعت یار جنگ اول مددگار معتمد مالگزاری تھے جنھوں نے ایک وسیع اور قومی درسگاہ کے قیام کی ضرورت محسوس کرکے اپنے ہمعصر اہل علم وفضل اور امرا سے درخواست کی تھی کہ اس طرف متوجہ ہوں اور اس قومی و ملکی کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اس اپیل میں مروجہ تعلیم کی خامیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے ایک جامعہ کے قیام کی تحریک کی گئی تھی۔ تعلیمی نقائص کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا:

> "ہرگاہ غوری شود بدریافت می رسد کہ دریں دیار نہ تعلیم عام مفید وکافی است و نہ تعلیم خاص و ہمچناں نہ طرز تعلیم درست است ونہ کتب متداولہ مناسب زیراکہ در تعلیم عام واقفیت برتاریخ وجغرافیہ وحساب واقلیدس وجبر ومقابلہ تا حدے معین درست است ودرایں جا بعذر گذاشت ایں ہمہ صرف بر آموختن زبان فارسی حسب رواج اکتفا می شود وآں ہم باوجود ضائع شدن اکثرے از اوقات عمر عزیز چناں کہ باید نفع بطالبین حاصل نمی شود" [۱]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ملک وقوم کی مروجہ فارسی تعلیم کو نامناسب سمجھتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جہاں اُردو اور مختلف علوم وفنون کی

---

[۱]: بدر شکیب۔ جامعہ عثمانیہ ۱۹۷۱ء کراچی ص ۱۳۵

اعلیٰ تعلیم ہو اور انگریزی بقدر ضرورت سکھائی جائے کہ جدید علوم کو اس کے ذریعہ سیکھ سکیں۔ یہ تحریک جب سالار جنگ اول مختار الملک کی خدمت میں پیش ہوئی تو انھوں نے لکھا :

" ہمہ را حرفاً حرفاً دیدم و مسرور شدم و تحسین کردم .... خدا کند تمام اہل ملک را محبت ملکی و توجہ بمعقولیت حاصل شود۔ در اکثر مطالبہ اتفاق دارم و ایں تدبیر را مفید می پندارم" [۱]

حیدرآباد میں اس وقت اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دینے کا امکان نہ تھا۔ ایک طرف مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے فوائد تھے تو دوسری طرف حکمران طبقہ کی زبان میں مہارت پیدا کرنے کے فوائد۔ تیسرے فارسی زبان کی برتری۔ ریاست حیدرآباد میں اردو کا مقابلہ انگریزی سے نہیں فارسی سے تھا۔ نواب مختار الملک سر سالار جنگ (۱۸۵۲ - ۱۸۸۳) شدت سے اس اصول پر عمل پیرا تھے کہ فارسی زبان کو ریاست کی سرکاری زبان برقرار رکھا جائے۔ وہ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے سخت مخالف تھے [۲]۔ شمالی ہند میں انگریزوں نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کی بجائے اردو کو دفتروں اور عدالتوں کی زبان قرار دیا لیکن حیدرآباد میں سر سالار جنگ اول نے ایسا نہ ہونے دیا اور اپنی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا رہے اس لئے ان کے دور میں اردو زبان کو سرکاری زبان بنانا یا اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا مشکل تھا اور اس حد تک فضا ناسازگار تھی۔

اگر سالار جنگ اول کی مندرجہ بالا پالیسی کا نکتہ پیش نظر ہوتا تو ڈاکٹر زور یہ نہ فرماتے کہ " تاریخ بالکل خاموش ہے اور قطعاً رہبری نہیں کرتی کہ سالار جنگ کے اظہار خوشنودی بلکہ منظوری کے بعد بھی حیدرآباد میں ایک ایسی درسگاہ جس کا مرتبہ جامعہ کے برابر ہوتا کیوں قائم نہ ہو سکی " [۳] غرض سالار جنگ کی اس خوشنودی کے باوجود درسگاہ قائم نہ ہو سکی

---

[۱] : ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد ص ۱۸۷

[۲] :

[۳] ارمغان جشن طلائی جامعہ عثمانیہ مرتبہ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی ۱۹۶۹ء

اور کوئی عملی قدم اس بارے میں اٹھایا نہیں گیا۔

پھر اس قسم کی ایک اور تحریک دس سال بعد مختار الملک مرحوم کے جانشین نواب عماد السلطنت سالار جنگ ثانی کے زمانے میں رونما ہوئی۔ یہ تحریک برطانوی پارلیمنٹ کے رکن مسٹر بلنٹ کے تخیل جامعہ شرفیہ پر مبنی تھی۔ اس کی پیشکش کے لئے مسٹر بلنٹ کی موجودگی میں ۱۸۸۵ء کو اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف سادس کی صدارت میں بمقام باغ عامہ ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں نظام یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا جس کی صدارت حکمرانِ وقت نے کی۔ نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ دوم بھی شریکِ جلسہ تھے لیکن اس مرتبہ بھی تعلیم کے تعلق سے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے تخیل میں جمال الدین افغانی کا بھی دخل رہا ہے اور رکنِ پارلیمنٹ انگلستان مسٹر بلنٹ کا بھی۔ وہ (مسٹر بلنٹ) اور ان کی بیوی مسلمانوں سے کمال درجہ محبت رکھتے تھے اور ہندوستان کے ہر صوبے کے مشہور مسلمانوں سے مل کر ترغیب دلاتے تھے کہ ہندوستان میں ایک عربی یونیورسٹی باصول جدید قائم کی جائے۔ خود انگریز تھے مگر انگریزی ارباب حل و عقد کے اصول حکمرانی کے بڑے مخالف تھے۔ مسلمانوں کی طرفداری میں انگریزی حکام وقت چہ ادنیٰ چہ اعلیٰ کی مذمت میں رطب اللسان تھے۔ [۱]

جمال الدین افغانی ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد آئے تھے۔ وہ حیدرآباد کی تعلیمی پستی سے واقف تھے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۸۳ء کو ان کی ملاقات پیرس میں مسٹر بلنٹ سے ہوئی جہاں تبادلۂ خیال ہوا چنانچہ بلنٹ آخر نومبر ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد آئے۔ کچھ دنوں یہاں قیام کرکے بمبئی اور پھر کلکتہ گئے۔ ۲ جنوری ۱۸۸۴ء کو انجمن اسلامیہ کلکتہ کی میٹنگ میں اسلامی یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ پھر اس تجویز کو نظام (آصف سادس) کے سامنے رکھا جو اس وقت کلکتہ ہی میں تھے۔ یہ طے پایا کہ سالار جنگ ثانی کے ذریعہ ایک نوٹ

۱۔ کارنامۂ سروری صفحہ ۲۳۵

روانہ کیا جائے۔ نظام حیدرآباد کی واپسی کے بعد ۲۴ر جنوری کو بلنٹ نے جامعہ کی اسکیم پر تفصیلی نوٹ روانہ کیا جو کتاب "انڈیا انڈر رپن" میں ضمیمہ کے طور پر شریک ہے۔
سالار جنگ دوم نے ۱۳ر فروری ۱۸۸۴ء کو اس کا جواب دیا۔ لیکن اسی دوران بلنٹ ہندوستان سے چلے گئے اور یہ تحریک جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

ان واقعات کے کچھ ہی دنوں بعد اعلیٰحضرت غفران مکاں اور نواب عماد السلطنہ نیلگری تشریف لے گئے اور وہاں سرسید احمد بھی پہنچے تو جریدۂ "روزگار" نے یہ خبر شائع کی جو قیاس آرائیوں پر مبنی تھی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ صاحب ممدوح (سرسید احمد خان) نظام یونیورسٹی کی بنا کی مشورت کے لئے طلب کئے گئے ہیں۔"

یہ خبر صحیح ہو یا نہ ہو اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی جامعہ کے قیام کا خیال عام دماغوں میں کس طرح پرورش پا رہا تھا۔

اس موقع پر سرسید احمد خاں کے تعلیمی نقطۂ نظر اور بعد میں اس کی تبدیلی کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔

"ایک وقت تھا کہ سید احمد خاں نے برعظیم میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے میکالے کی تجویز کی مخالفت کی تھی مگر بعد میں انھوں نے اپنی رائے کو قطعاً بدل دیا۔ جب یہ بحث جاری رہی کہ الٰہ آباد اور پنجاب کی مجوزہ یونیورسٹیوں کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے تو انھوں نے اس ضرورت پر انتہائی زور دیا کہ مغربی علوم اور مضامین نہ صرف پڑھائے جائیں بلکہ ان کے لئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بھی بنایا جائے۔ وہ (سرسید) ابتدائی درجہ کی عام تعلیم کے لئے مادری زبان کو ذریعہ بنانے کے خلاف نہیں تھے مگر ان کو اس پر اصرار تھا کہ ثانوی درجہ اور اس کے بعد کی تعلیم انگریزی میں ہونی چاہیئے۔" [1]

---

[1] برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ اُردو ترجمہ۔ ہلال احمد زبیری ص ۳۱۵ ۔ ص ۳۱۶

سرسید ابتدا میں دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے موید تھے۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے اپنے مطالبات پارلیمنٹ تک پہنچانے کے لئے ایک انجمن " برٹش انڈین ایسوسیشن" کی بنیاد رکھی تھی جس کے ذریعہ ایک عرضداشت ۱۸۶۷ء میں ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک سے متعلق گورنر جنرل کو پیش کی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں دیسی زبان کی ایک علحدہ یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔ ان کا یہ ادعا تھا کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ تمام علوم و فنون کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل نہ کرے۔

سرسید احمد کی دور بینی پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے وقت میں دیسی یونیورسٹی کی تحریک اٹھائی جب انگریزی تعلیم سارے ملک میں اپنا تسلط جمارہی تھی۔ تحریک کے اہم الفاظ یہ تھے:

" جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی کی کوشش کریں تو ہم کیا کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کرسکتے جو ایک غیر ملک کی زبان کی بہ نسبت تحصیل علم کیلئے زیادہ مناسب ہو" [1]

اس عرضداشت میں سرسید نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ انگریزی زبان کا رواج ملک میں ہونا ضروری ہے۔ آج دنیا میں جن علوم کی گرم بازاری ہے ان سے فوائد حاصل کرنے کیلئے کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں کہ ہم انگریزی زبان کو سیکھیں لیکن کیا بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلیٰ درجہ کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم کا ذریعہ گردانا جائے۔

سرسید کے اس نظریۂ تعلیم میں تبدیلی اس وقت آتی ہے جب جمال الدین افغانی نے دیسی زبان کی تائید کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس وقت خود حیدرآباد کی مختلف انجمنوں کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کا بڑے زور وشور سے مطالبہ ہورہا تھا۔ ایسے موقع پر سرسید نے حکومت سے اشتراک عمل اور اس کی خوشنودی کیلئے اپنے قدیم موقف سے گریز کرتے ہوئے اپنے ایک خطبہ میں کہا کہ یہ خیال بہت پرانا ہے کہ

---

[1] مقالات سرسید۔ مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی ص ۵۱، ۵۲

اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لئے اور ملک کی ترقی کے لئے زیادہ مفید ہے۔
دوسرے ملکوں کی مثال ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں کیونکہ ان میں اور ہندوستان میں بڑا فرق
ہے۔ ان ملکوں میں ایک ہی قوم اور ایک ہی زبان حکومت کرتی ہے مگر ہندوستان میں نہ
ہندستانی حکومت ہے اور نہ یہاں ان کی زبان حکمراں۔ قومی ترقی اس بات پر منحصر ہے
کہ وہ اپنی فتحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرے۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کا
تناسب نہ ہو اس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے ؎۔ چنانچہ انھوں
نے اب ہندوستان کو یہ راہ دکھائی

" ہمارے لئے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے
یوروپین لٹریچر اور یوروپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کریں
اور اس سے بھی زیادہ اہمیت ہو تو آکسفورڈ، کیمبرج کی یونیورسٹیوں
میں تعلیم کو جائیں "

اور یہ تجویز پیش کی کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جائے۔

کئی سال بعد نواب سروقار الامراء کے عہدِ وزارت میں بھی قیام جامعہ کے خیال کی
بازگشت ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں جو جلسۂ تقسیم انعامات نظام کالج میں (جس کی ابتدار
۱۸۷۸ء) میں حضرت غفراں مکاں کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اُس میں سروقار الامراء
نے بحیثیت وزیر اعظم ایک یونیورسٹی کے قیام کا بڑی صراحت کے ساتھ ذکر کیا۔ اس تجویز
کو عہدیداران مملکت عزیز مرزا (معتمد تعلیمات و عدالت) کی بھی تائید و حمایت حاصل ہوگئی
جس کی وجہ سے مدرسۂ دارالعلوم کے ایک مشرقی یونیورسٹی میں تبدیل ہو جانے کے اتنے
امکانات پیدا ہو گئے تھے کہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا شبلی نعمانی نے "الندوہ" میں لکھ
دیا کہ وہ دارالعلوم ندوہ کو مجوزہ مشرقی یونیورسٹی سے ملحق کر دیں گے۔ نتیجتاً اگرچہ اس
قسم کی جملہ تحریکیں بار آور نہ ہو سکیں۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس زمانے میں حیدرآباد میں عام
طور پر علمی بیداری پیدا ہوگئی۔

دارالعلوم حیدرآباد کی قدیم درسگاہ تھی۔ اس کا درخشاں زمانہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا

ہے جبکہ اس کا الحاق جامعہ پنجاب سے ہوا۔ دارالعلوم میں مولوی فاضل تک تعلیم کا انتظام تھا اور امتحانات پنجاب یونیورسٹی کے ہوتے تھے۔ اس کے فیض یافتہ افراد ملک کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ دارالعلوم آئندہ وجود میں آنے والی جامعہ کا نقش اول تھا۔ جامعہ کا خواب اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نے دیکھا تھا۔

اس وقت تک نظام کالج قائم ہو چکا تھا۔ جس کی بنیاد ۱۸۷۰ء میں پڑی تھی۔ نظام کالج مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ کثیر مصارف کے مقابلہ میں یہاں کے نتائج غیر تشفی بخش تھے۔ ۱۸۹۹ء میں نظام کالج کے (۷۷) طلبا امتحان میٹرک میں بیٹھے اور صرف (۷) نے کامیابی حاصل کی تو اس کا اثر نوجوانوں کے ذہنوں پر ہوا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم پر بوجوہات ایک جمود، ایک پستی طاری ہونے لگی تھی۔ حکومت کی مسلسل کوششوں کے باوجود دارالعلوم کی عمارت قدیم بنیادوں پر ٹھہرتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس ہمت شکن ماحول نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقوں میں ایک بے چینی پیدا کردی تھی۔ اس بے چینی اور اضطراب پر قابو پانے اور حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے دارالعلوم کے چند فارغ التحصیل افراد محمد مرتضیٰ، عبدالقدیر صدیقی، ملا عبدالباسط، رضی الدین حسن کیفی اور مدیر صحیفہ اکبر علی نے مستعدی دکھلائی۔ ان اصحاب نے اپنے حصول مقصد کے لئے ایک منظم جدوجہد کی ضرورت محسوس کی جس کا نتیجہ "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کی صورت میں ظاہر ہوا (۱۹۱۳ء)۔ اس انجمن کے قیام کی کہانی خود اس کے معتمد محمد مرتضیٰ کی زبان میں یوں ہے:

> "دارالعلوم میں ایک علمی انجمن کے قیام کی تحریک اسی زمانے سے ہونے لگی تھی جبکہ پنجاب یونیورسٹی کے سلسلۂ تعلیم سے اس میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پہلے دور کے طلبہ تو سوچتے ہی میں رہے لیکن دوسرے دور کے طلباء نے جو بلحاظ رفتار زمانہ عملیت میں ایک دو قدم آگے بڑھ گئے تھے ایک انجمن قائم کی جس نے بہت کچھ ذوق اور زندہ دلی پیدا کی۔" [1]

---

[1] رپورٹ سالانہ انجمن طلبائے قدیم ۱۹۱۵ء

اس انجمن کے قیام سے ایسے سینکڑوں طلبہ کے لئے جو دارالعلوم کی تنزل پذیر حالت سے متاثر تھے اور ساتھ ہی ملک کی تعلیمی ترقی کے بھی شدت سے خواہاں تھے۔ ان کو ایک مشترکہ میدانِ عمل اور ایک مرکز فراہم ہوگیا۔

قیام جامعہ کی تحریک میں اس انجمن نے بہت اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے اراکین نے جو اربابِ ذوق و نظر تھے اُردو کے سرچشمہ علوم و فنون جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لئے ہر طرح کوشش کی۔ اس انجمن کے ضابطہ میں اس کے مقاصد کچھ اس نوعیت کے تھے۔

۱۔ قدیم طلبا میں باہم ایک رابطہ اتحاد قائم کرنا جس سے علمی ترقی میں مدد ملے۔
۲۔ دارالعلوم کے یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنا۔
۳۔ دارالعلوم کی قدیم روایات کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے وسائل فراہم کرنا۔

اس انجمن کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجمن نے ہر سال اپنے دائرہ عمل میں اضافہ کیا۔

اسی زمانے میں محمد مرتضیٰ نے تعلیمی ترقی کی سست گامی سے متاثر ہوکر ایک خیال آفریں مضمون بعنوان " حیدرآباد کی تعلیمی حالت ترقی کیوں نہیں کرتی " لکھا۔ اس تعلق سے مدراس نے بھی سرگرمی دکھلائی۔ مولوی عبدالقادر (نصیرالدین ہاشمی کے والد) نے مدراس کے ہفتہ وار اخبار " مخبر دکن " میں ۱۸۹۹ء کے لگ بھگ ایک سلسلہ مضامین کا بعنوان " اصلاحِ تعلیمات حیدرآباد " شروع کیا۔ ان مضامین میں حیدرآباد میں تعلیمی ترقی کے امکانات واضح کئے گئے اور اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہ نظام کالج کے مصارف سالانہ کئی لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم اور حیدرآباد کی تعلیمی پستی کو ظاہر کیا گیا۔ نظام کالج کو مدراس یونیورسٹی سے منقطع کرکے حیدرآباد میں " نظام یونیورسٹی " کے قیام کی تجویز پیش کی۔

نظام کالج کے حوصلہ شکن نتائج کی بناء پر سررشتۂ تعلیمات میں یہ تحریک پیش ہوئی کہ نظام کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی کے بجائے کلکتہ یونیورسٹی سے کیا جائے۔ معتمد تعلیمات نے اس تحریک سے اتفاق نہیں کیا۔ جب یہ کاروائی نواب فخر الملک

کے ملاحظہ میں پیش ہوئی جو معین المہام تعلیمات تھے تو موصوف نے مولوی عبدالقادر کے مضامین کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے دی کہ حیدرآباد میں ایک علاحدہ یونیورسٹی قائم کرنی چاہیئے۔ مدارالمہام وقت نواب میر وقار الامراء (اقبال الدولہ) نے اس کی مخالفت کی تاہم معاملہ کیبنٹ کونسل تک گیا اور کارروائی لارڈ کرزن کے مقرر کردہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے تک ملتوی کی گئی۔ یہ ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد محمد مرتضیٰ نے ۱۹۰۲ء میں یعنی قیام جامعہ سے پندرہ سولہ سال قبل ایک کتاب "روح ترقی" کے نام سے شائع کی جس میں اس سوال کا جواب دیا گیا کہ حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا؟ اور پھر "نظام یونیورسٹی" کے قیام اور اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی تجویز پیش کی و نیز مغربی زبانوں سے علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کے لئے دارالترجمہ قائم کرنے کی تحریک بھی کی۔[۱]

"روحِ ترقی" میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا اقتباس یہ ہے:

"ابنائے ملک اس وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان (اُردو) کو تازہ رکھیں۔ مغربی زبان کے سیلاب کے ساتھ اس زبان کی ترقی اس مجنونانہ بڑ کی تکذیب کرتی ہے کہ ایک دن مغربی زبان (انگریزی) ہماری اصلی زبان ہو جائے گی۔ وہ دکن ہی ہے جس نے ملکی لحاظ سے اُردو کی ضرورت سمجھی اور آصف سادس کے عہد میمنت میں اُردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان ہے۔ خصوصاً شاہ دکن کی مربیانہ نظر عاطفت اور فیض عام نے ہی اُردو زبان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مصنفین کو علمی تحقیقات کی طاقت بخشی۔۔۔۔ اس بناء پر اب حیدرآباد اُردو کا اصل مرکز ہو سکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اس میں مضمر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے۔ اسی میں ملک

---

[۱] نصیر الدین ہاشمی۔ مولوی عبدالقادر۔ مارچ ۱۹۶۳ء

کی بہبودی ہے۔ اُردو عام تعلیم کیلئے کافی صلاحیت رکھتی ہے۔" [۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام جامعہ سے متعلق اب تک جو تحریکیں ہوئی تھیں وہ ناکام ثابت ہو چکی تھیں اور اہلِ ملک کچھ مایوس ہو چلے تھے، جبھی تو محمد مرتضیٰ کو اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنا پڑا۔ آخر میں انھوں نے نظام یونیورسٹی کا عنوان بھی قائم کیا۔ گذشتہ ناکامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"اگر آج ہم نظام یونیورسٹی کا نعرہ مارنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی اثر مرتب نہیں ہوسکتا اس لئے ایسی تجویز پیش کی گئی ہیں جو سہل الحصول کہی جاسکتی ہیں۔ بڑا حصہ ایسا ہے جن کے جاری ہونے میں کسی قسم کی عملی و مالی دقتیں حائل نہیں ہیں۔" [۲]

لارڈ کرزن کے نافذ کردہ قانون جامعات برطانوی ہند کی بناء پر جامعہ پنجاب نے ۱۹۰۶ء میں اپنے امتحانات عربی و فارسی کا انقطاع کیا۔ برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ خود مدراس یونیورسٹی ایسے امتحانات کا سلسلہ قائم کرے لیکن مدراس یونیورسٹی سے اس مجوزہ انتظام میں تاخیر ہوئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا [۴] نے فوراً ایک پرائیوٹ اکیڈمی "انجمن معیارالعلوم" کے ذریعہ امتحانات لئے جانے کا اعلان کرایا اور اکیڈمی کو سرکار سے تسلیم کروانے کی استدعا کی۔ ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے کا خیال تھا کہ بتدریج ملک میں ایک قومی یونیورسٹی غیر سرکاری اہتمام سے قائم کردی جائے۔ [۳]

ملا عبدالقیوم، مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی اور دیگر علماء نے جامعہ پنجاب کے امتحانات کے مماثل امتحانات خانگی طور پر لینے اور اسناد دینے کا انتظام کیا۔ نواب فخر الملک نے پرزور طور پر تجویز کی کہ خود سرکاری طور پر امتحان لینے اور سند دینے کا انتظام ہونا چاہیئے بیرونی جامعہ کی طرح غیر سرکاری ادارہ کی ضرورت نہیں۔ مدارالمہام وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اس تجویز سے اتفاق کیا چنانچہ قواعد وضوابط نافذ کرکے

---

۱ ۔ محمد مرتضیٰ۔ روح ترقی ص۲۵ ۲ ۔ محمد مرتضیٰ۔ روح ترقی ص۵۲

۳ ۔ حافظ محمد مظہر۔ دارالعلوم کے سپوت ص۲۹ ۴ ۔ سروجنی نائیڈو کے والد

امتحانات جامعہ پنجاب ہی کے قواعد کے مطابق شروع کئے گئے۔ اسی زمانے میں حسین لطیف اللہ طالب علم مدرسۂ دارالعلوم نے "نظام یونیورسٹی" کے عنوان سے ایک مضمون "مخبر دکن" (مدراس) میں لکھا نیسر آصفی (مدراس) میں بھی مدارالمہام کے نام کھلی چٹھی کے طور پر اُردو کو ذریعہ تعلیم بناکر ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک شائع ہوئی تھی۔ ؎

اب خیال ہوا کہ دارالعلوم میں مولوی فاضل سے بھی اونچے درجہ کی تعلیم کا بندوبست ہو۔ چنانچہ مدرسہ کی تنظیم کا خیال عماد جنگ اول معتمد عدالت و تعلیمات کو پیدا ہوا۔ نواب فخر الملک معین المہام تعلیمات ہوئے تو ملا عبدالقیوم سے ایک یادداشت مرتب کرنے کی سرکاری طور پر خواہش کی گئی۔ اس اثنا میں ملا عبدالقیوم اور عماد جنگ اول کا انتقال ہوگیا۔ نواب سربلند جنگ معتمد عدالت کو تعلیمی اُمور سے دلچسپی نہ تھی اس لئے مزید پیش رفت نہ ہوسکی۔

"انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" ایک نئے عصر کے آغاز کے وقت پیدا ہوئی تھی۔ اس عصر کی تحریکات کو کامیاب بنانے میں اس نے بھرپور کوشش کی۔ اس سلسلے میں انجمن کے دارالعلوم کا ساٹھ سالہ جشن جوبلی منعقدہ ۱۹۱۲ء قابل ذکر ہے۔ اس تاریخ ساز جوبلی کو حیدرآباد کی ترقی اُردو سے یک گونہ تعلق ہے کیونکہ اس نے جہاں اہل ملک کو محسوس کرایا کہ ان کی اجتماعی کوششیں کامیاب ہوسکتی ہیں جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لئے بھی رائے عامہ ہموار کی اور ساتھ ہی صاحب رائے افراد کی نہایت خوش اسلوبی سے ترجمانی کی۔

جشن جوبلی کے انتظامات کے لئے جو کمیٹی تشکیل دی گئی۔ وہ درس گاہ کے قدیم طلباء کے علاوہ قادر حسین خاں (ناظم معلومات عامہ)، محمد منعم (مددگار معتمد فینانس) مرزا محمد علی (نائب ناظم جنگلات) پر مشتمل تھی۔ یہ شائد پہلا مرتبہ تھا کہ مشرقی و مغربی تعلیم یافتہ اصحاب ایک جگہ جمع ہوئے۔ انتظامات میں دارالعلوم کے جن فارغ التحصیل

؎ : اقتباس رسالہ اُردو۔ اپریل ۱۹۴۱ء

اشخاص نے حصّہ لیا ان میں محمد مرتضیٰ کے علاوہ مرزا محمد بیگ (اول تعلقدار مال) خواجہ فیاض الدین (اول تعلقدار آبکاری) اسداللہ صدیقی (صدیق یار جنگ رکن عدالت العالیہ) اکبر علی (مدیر صحیفہ) ملا عبدالباسط اور عبدالوہاب عندلیب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ؎۱
اس جلسہ میں شمس العلما نواب عزیز جنگ ولاؔ اور ضیاء یار جنگ بھی شریک تھے۔

۱۹۱۳ء میں یہ تقریب بڑے اہتمام کے ساتھ منائی گئی۔ جلسہ کی صدارت میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر ثالث مدار المہام نے فرمائی۔ جس میں نواب فخر الملک بہادر، معین المہام اور جملہ ارباب تعلیمات اور دیگر سررشتوں کے عہدہ دار بھی موجود تھے۔ اس تقریب کی بدولت ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو مدت کے دبے ہوئے خیالات کو پہلی دفعہ حکومت، سررشتہ تعلیم اور عوام کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ کہنے کو تو یہ دارالعلوم کی ۶۰ سالہ جوبلی کی تقریب تھی لیکن اس میں جو تقریریں ہوئیں اور ان سے جو علمی اور تعلیمی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان کا ملک کی تعلیمی ترقی پر گہرا اثر پڑا۔ دارالعلوم کی تاریخ پر جو مضمون پڑھا گیا وہ درحقیقت حیدرآباد میں ترقی تعلیم کا ایک جامع خاکہ تھا۔ تحریکات میں سب سے اہم حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کے قیام کا مطالبہ تھا۔ تحریک یہ تھی:

> "ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے جس کے امتحانات ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور پر قائم ہو۔ بالفاظِ دیگر "نظام یونیورسٹی" قائم کی جائے۔ مشرقی یونیورسٹی قائم ہونے کیلئے حیدرآباد میں کسی قسم کی دقت نہیں۔" ؎۲

انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم ایک فعال ادارہ تھا۔ اس نے اشاعتِ تعلیم کے مقصد کو ہمہ گیر بنانے کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں یہ انجمن "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس انجمن کے قیام میں

؎۱ : عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی۔ ڈاکٹر زور ص ۴۴

؎۲ : عبدالقادر سروری۔ حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی ص ۷۴، ۷۵

بھی دارالعلوم کے قدیم طلبہ کا ہاتھ تھا جس کی روح رواں محمد مرتضیٰ تھے۔
ایجوکیشنل کانفرنس کا خاکہ تیار کیا گیا اور اہل ملک کے نام اپیل جاری کی گئی جس میں قیام جامعہ کی خواہش اس طرح ظاہر کی گئی۔

"ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے۔ مختلف امتحانات، علمی، قانونی، طبی، انجینئرنگ، سیول سروس اور دیگر سررشتہ جات متعلقہ سب یہاں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ سب ایک سلسلے میں رابطہ ہوں۔ تمام امتحانات میں جہتہ جامعہ ملحوظ رہے۔ کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جبکہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کا محور بنے۔" [۱]

اس کانفرنس کے بنیادی مقاصد یہ تھے:

(۱) علمی سوسائٹی کا قیام جو تقریروں اور علمی تحریرات کے ذریعہ علمی تازگی پیدا کرے
(۲) توسیع دائرہ تعلیم (اشاعت تعلیم)
(۳) اصلاح تعلیم

ان مقاصد کے لئے حسب ذیل نظام العمل مقرر کیا گیا۔

(الف) علوم و فنون اُردو میں منتقل کئے جائیں۔
(ب) اُردو کو اعلیٰ اور فوقانی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔
(ج) یونیورسٹی کا قیام۔

یہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ملک کی واحد وقیع اور سنجیدہ انجمن تھی۔ ایسے صحت بخش اصولوں پر اس نے کام کی ابتدا کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کی اہم ترین سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی۔ اس کی رائیں اور اس کی تحریکات کو حکومت نے کشادہ پیشانی کے ساتھ پسند اور منظور کیا۔ کانفرنس کی اس کامیابی میں محمد مرتضیٰ کی والہانہ سعی کو بہت بڑا دخل ہے۔

---

[۱] روداد کانفرنس ص۵

کانفرنس کا پہلا اجلاس یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو بمقام ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت سر اکبر حیدری (حیدر نواز جنگ) نے کی جو اس زمانے میں معتمد تعلیمات تھے۔ انھوں نے ملک کے اس عام رجحان اور شدتِ احساس کو محسوس کر کے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں قیام جامعہ کی تحریک پر خاص زور دیا۔ محض مغربی تعلیم کو غیر تشفی بخش قرار دیتے ہوئے ملکی زبان یعنی اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"تقریباً ایک صدی کے تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم ہمارے ملک کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو، وہ کوئی تعلیم نہیں، اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے سودمند نہیں ہوسکتی۔ ایک تو یہ ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ دوسرے ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں خوبیوں کو ایک جگہ جمع کی جائے .....

خدا نے چاہا تو چند سال میں دار العلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک کے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔"[1]

اس اجلاس میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو بھی تھے انھوں نے اُردو میں علوم و فنون کے تراجم کی شدید ضرورت پر تقریر کی اور حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کی تحریک پیش کی۔

۱۹۱۵ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا کے خطبۂ صدارت میں جسٹس

---

[1] : روئیداد کانفرنس صـ ۴۷

سر عبدالرحیم نے حیدرآباد کو مشرقی یونیورسٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ ندوہ میں ایک ریزولیوشن دارالعلوم کو یونیورسٹی بنائے جانے کیلئے منظور ہوا۔
انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم کے تیسرے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۶ء میں قیام جامعہ کے تعلق سے اس طرح توجہ دلائی گئی۔

"حقیقت میں یہ امر تازیانہ عبرت ہے کہ حیدرآباد جہاں پہلے سے علوم قدیمہ وجدیدہ کے اجتماع کی کوشش دارالعلوم کے ذریعہ ۶۳ سال پیشتر شروع ہوئی۔ اس طویل عرصہ میں مشہور آفاق دارالعلوم بن جانے کے عوض ایسی حالت میں ہو کہ دور دور سے اس کی ترقی کے لئے توجہ دلائی جائے سال بھر پہلے جسٹس عبدالرحیم نے پونہ کانفرنس میں مشرقی یونیورسٹی کے لئے حیدرآباد کو توجہ دلائی ہے اور ابھی حال میں ندوہ میں ایک ریزولیوشن ہمارے دارالعلوم کو یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا"۔ [1]

اس درمیان جنگ عظیم کے اثرات پھیلنا شروع ہوگئے تھے اور ملک کی تمام تر توجہات اور ذرائع اسی کے لئے وقف ہوگئے تھے۔ اس لئے یونیورسٹی کے قیام کی یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی البتہ اس کے قیام کے لئے زمین ہموار ہوگئی تھی اور ملک کی ساری فضا اس کی تائید میں تھی۔
ایک سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس اورنگ آباد میں ہوا اور اس کی صدارت محمد حبیب الدین صدر محاسب سرکار عالی نے کی۔ انھوں نے قیام جامعہ کا زیادہ مدلل اور ہمت افزا طریقے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"اس کانفرنس کے اجلاس کا یہ دوسرا سال ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ترقی تعلیم کے اہم کام کے لئے انتہائی مقصد مرکوز خاطر رکھیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے متفقہ کوششیں

---

[1] برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ۔ اُردو ترجمہ بلال احمد زبیری ص ۳۱۵ - ۳۱۶

بھی کی جائیں۔ ہمارا مقصد اصلی ترقی تعلیم تو ہے لیکن لفظ تعلیم بہت سے شعبوں پر حاوی ہے مثلاً اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانویہ، تعلیم ابتدائی تعلیم نسواں، اخلاقی، جسمانی، صنعت و حرفت، زراعت وغیرہ کی تعلیم۔ یہ سب شعبے بجائے خود مکمل نہیں ہو سکتے۔ جب تک ممالک محروسہ سرکار عالی میں بلحاظ حالات ملک و مقاصد رعایا برایا ایک جامع العلوم یعنی یونیورسٹی قائم نہ کی جائے .....

پس یہ وہ پاک خطہ ہے جہاں جامع العلوم جیسی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام ہر طرح مناسب و موزوں ہے جو مغربی علوم و فنون کی تعلیم اور اختراعات و ایجادات کے مواقع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ کا مامن اور دلکش مسکن بن سکے" [۱]

اس طرح ایک جامعہ کا خیال اور اس جامعہ کے اجزائے ترکیبی کا تصور تشکیل پا چکا تھا۔ اب اس تصور کو مجسم شکل دینے اور عملی جامہ پہنانے کی دیر تھی اور ایک روشن خیال سرپرست وہوشیار معمار کی ضرورت تھی۔

عہد عثمانی کو ملک کا تعلیمی نظام درست کرنے میں کچھ عرصہ لگا اور اس سعی کے دوران ایک صحت بخش نظام تعلیم کے تصور کا نشو و نما ہوا۔ اس تصور کو مجسم کرنے میں اس زمانے کے معتمد تعلیمات نواب سر حیدر جنگ بہادر نے معمار اول کا کام کیا۔ انھوں نے تعلیمی ضروریات کے متعلق ایک مفصل یادداشت مرتب کر کے اعلیٰ حضرت آصف سابع کے ملاحظہ میں پیش کی۔ اس تفصیلی عرضداشت میں مروجہ تعلیم کے نقائص کی وضاحت کی گئی تھی اور حیدرآباد کے لئے ایک جامعہ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی جو اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھی۔

---

[۱] سرگزشت جامعہ عثمانیہ۔ بدر شکیب صفحہ ۱۴۳

تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت
اور
اردو بحثیت ذریعہ تعلیم

تعلیمی نقطۂ نظر سے زبان کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔ زبان علم کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور ذریعہ تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت کو بالاتفاق تسلیم کیا جاچکا ہے ۔ مادری زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بچہ مادری زبان اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ سیکھتا ہے ۔ ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ جب تک غور و فکر اور سوچنے کا آلہ وہ زبان نہ ہو جس سے معلم و متعلم خاطر خواہ واقف ہوں اس وقت تک دونوں کے درمیان سہل رابطہ پیدا ہونا ممکن نہیں ۔ جب علم مادری زبان کی وساطت سے آتا ہے تو وقت اور ذہنی قوت کی تضیع نہیں ہوتی ۔ خیالات کو اپنانے میں انہیں توڑنا پھوڑنا نہیں پڑتا ۔

جہاں تک ابتدائی تحتانی اور فوقانی جماعتوں کا تعلق ہے اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ تعلیم مادری زبان میں لازمی طور پر ہو ۔ دیسی زبانوں کی حد تک عملی طور پر ایسی سہولتیں موجود رہتی ہیں اور حالات بھی موافق ہوتے ہیں ۔ سوال دراصل اعلیٰ یعنی جامعاتی سطح کی تعلیم کا ہے جس کا نظریاتی اور عملی دونوں نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے ۔ چنانچہ "ہند جامعاتی تعلیم کانفرنس" جو بمبئی ۱۹۳۹ء میں ہوئی ۔ یہ سوال متنازعہ نہیں رہا ۔ کانفرنس میں ہندوستان بھر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق و بیک آواز یہ قرارداد منظور کی کہ

> "اس (کانفرنس) کی غور کردہ رائے ہے کہ تعلیم کے مختلف مراحل بشمول یونیورسٹیوں کی تعلیم کے حصول کیلئے طالب علم کی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیئے"

اس قسم کی مثالی و معیاری تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ جدید علوم میں مقامی زبانوں میں درسی کتابوں کا فقدان ہے جس سے لسانیاتی ریاستیں دوچار ہیں۔ نتیجتاً اعلیٰ تعلیم میں مقامی زبانیں اپنا رول ادا نہیں کرپاتی ہیں ۔ جامعاتی سطح پر یہی مادری زبان کا المیہ ہے ۔

تعلیمی اور تدریسی میدان میں غیر زبان میں تعلیم دینے کے جو تجربے ہورہے ہیں اور جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں ان سے غیر زبان میں درسی تعلیم کے بے شمار نقائص سامنے آتے ہیں ۔ ہندستان کی جامعی تعلیم کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ طالب علم جو کچھ پڑھتے ہیں اسے سمجھتے نہیں وہ صرف علم کا ذخیرہ کرتے ہیں ۔ یادداشتیں طالب علم کے حافظہ میں اسطرح بھری جاتی ہیں گویا اس کا دماغ کوئی خالی ٹوکری ہے ۔ غیر زبان کے حصول کی پیچیدگیاں اجازت نہیں دیتیں کہ عام طالب علم اپنی زبان کو اپنی فکر و تعقل کا آلۂ کار بنائے ۔ ان کی واقفیت چونکہ ایسی زبان سے واجبی اور کم ہوتی ہے وہ مجبوراً نصابی کتب کو حافظہ کے زور سے ازبر کرلیتا ہے ۔ بعض طالب علم تو صفحے کے صفحے ' کتابوں کی کتابیں رٹ ڈالتے ہیں ۔ غیر زبان پر قابو پانے اور اس کی اصطلاحات و محاورات کو سمجھنے میں وہ اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ اصل مضمون فروگزاشت ہوجاتا ہے ۔ غیر زبان میں مہارت پیدا نہ ہونے کے سبب بیشتر طلبا اظہار مافی الضمیر پر قادر نہیں ہوسکتے اس لئے اپنا بڑا نقصان کرلیتے ہیں ۔

ایک اور اہم بات یہ کہ تعلیم جب غیر زبان کے ذریعہ دیجاتی ہے تو اس کا تعلق قومی زندگی اور قومی تہذیب کے سرچشمے سے قائم نہیں ہوسکتا لہٰذا ایسی تعلیم سطحی اور ناقص رہتی ہے نیز قومی مسائل و مفاد سے طالب علم کو بے نیاز اور بے تعلق رکھتی ہے ۔ بیشتر عام فہم و ادراک کے بچے جو دماغی اعتبار سے اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس سے محروم رہ جاتے ہیں سوائے ان مخصوص شاذ افراد کے ' جن میں زبان سیکھنے کی غیر معمولی قابلیت و ذہانت ہوتی ہے ۔

برخلاف اس کے مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں طلبا کے تفکر اور تخلیق کے سرچشمے پھوٹتے ہیں ۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اپنی زبان میں تعلیم پانے والے اپنے کام میں تعلیمی امور میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ اور دماغی اعتبار سے زیادہ چست ہوتے ہیں ۔ مادری زبان کے ذریعہ تحصیل علم کرنے والا زیادہ تیزی سے تعلیم کے مراحل طے کرتا ہے کیونکہ اس کو دوسری زبان سیکھ کر اس میں خیالات کی ترجمانی کرنے یا اظہار کرنے کے مشکل و دشوار مرحلوں سے گزرنا نہیں پڑتا ۔ وقت کی بچت ہوتی ہے ۔ دماغ پر غیر معمولی بار نہیں پڑتا اور سب سے بڑھکر یہ کہ مادری زبان کے ذریعہ حاصل کی گئی تعلیم خود اعتمادی اور خودداری پیدا کرتی ہے

لہذا تعلیم میں اثر اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے اور طلبا کو الفاظ کے بجائے علوم اور حافظہ کے بجائے غور و فکر کا استعمال کرنے کیلئے مادری زبان کو ذریعہ بنانا ناگزیر ہے۔ ملک میں تعلیم کو عام کرنے اور تعلیم کی روشنی پھیلانے میں صرف مادری زبان ہی معاون بن سکتی ہے۔ طالب علم میں تقلید کا عنصر کم سے کم ہوجاتا ہے۔ علمی ذوق جو ندرت وجدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے علمی مشاغل کی صلاحیت ابھرتی اور پروان چڑھتی رہتی ہے۔

تعلیم و تدریس میں مادری زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے قبل ملک میں اردو کے موقف کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دہلی کالج دہلی کالج ملک کی پہلی درسگاہ تھی جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ دہلی کالج ۱۷۹۲ء میں بمقام دہلی قائم ہوا۔ ابتداء میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان تھی۔ ۱۸۲۵ء میں اورنٹیل کالج کی بنا پڑی۔ یہ ہندستان کی پہلی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً ہیئت، ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو زبان میں دیجاتی تھی۔ البتہ نصابی کتب موجود نہ ہونے سے دشواری بہت تھی اس لئے اس اقدام کی بڑی مخالفت ہوئی تاہم اردو کا میدان ہموار کرنے کی کوشش برابر جاری رہی۔ ۱۸۳۵ء میں سرکاری تعلیمی کمیٹی (ایجوکیشنل کمیٹی) قائم ہوئی۔ اس کمیٹی کا مقصد اردو میں نصابی کتب کی تیاری و فراہمی تھا چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ قابل حضرات کو مطلوبہ کتب کی تالیف و ترجمہ کیلئے آمادہ کیا جائے۔

۱۸۴۳ء میں جدید پالیسی کے ردعمل کے طور پر ایک اور تحریک دیسی زبانوں کے حامیوں کی کوششوں سے عمل میں آئی اور انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی قائم کی گئی۔ اس سوسائٹی کے ذی علم اصحاب نے اردو کے دامن کو مغربی علوم وفنون سے مالامال کیا اور ادب عالیہ کے ترجموں کی راہ ہموار ہوئی۔ انجمن نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے قواعد وضع کئے تھے اس سوسائٹی نے سنسکرت، عربی، فارسی کے اعلیٰ درجہ کے تصانیف نیز انگریزی کے مفید کتب کے دیسی زبانوں میں عمدہ ترجمے کرکے اہل ہند کی بڑی خدمت کی [۱]۔

سائنٹفک سوسائٹی دہلی کالج بند ہونے کے بعد سب سے پہلے اس کا احساس سرسید احمد خاں کو ہوا چنانچہ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے اردو میں مغربی تصانیف کا ترجمہ

---

[۱]۔ خطبہ گارساں دتاسی (پانچواں خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء)

کرانے کی غرض سے سائینٹفک سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ ترجمہ کے کام کو انگریزی زبان کی اشاعت سے زیادہ ضروری سمجھا۔ تنخواہ یاب مترجمین کو مقرر کیا گیا۔ سر سید نے اپنا ذاتی مطبع بھی سوسائٹی کے لئے وقف کر دیا۔ اس سوسائٹی نے تقریباً (۴۰) چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔

برصغیر میں اردو زبان کی ہمہ گیریت کے پیش نظر ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ اردو کو اعلیٰ تعلیم کیلئے ذریعہ MEDIUM قرار دینے کی تجویزیں سامنے آنے لگیں جن کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے سالانہ خطبات میں کیا ہے۔ ۲؎

یہ تو حیدرآباد سے باہر کی بات تھی خود حیدرآباد میں اردو کے موقف کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقف کافی مستحکم تھا جسکی بنیاد دکن میں صدیوں پہلے پڑ چکی تھی۔

اردو یوں تو ہندستان بھر میں بولی جاتی تھی لیکن تصنیف و تالیف میں استعمال ہونے کا شرف اسکو بہت پہلے دکن میں حاصل ہوا۔ اکثر دکنی مصنفین فارسی کے بجائے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کرنے لگے تھے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دکنی اردو کا چلن عوام میں بڑی حد تک ہو گیا تھا۔ تصنیف و تالیف کے سبب یہ زبان رفتہ رفتہ یہاں علمی و ادبی حیثیت اختیار کرتی گئی۔ چنانچہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے زمانہ عروج میں یعنی گیارہویں صدی ہجری تک اس زبان میں شاعرانہ، فلسفیانہ اور تصوفانہ خیالات کے اظہار کی کافی صلاحیت پیدا ہو چلی تھی۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے ساتھ دکنی بولی کو بھی عروج ہوا۔ بیسیوں دکنی شاعروں اور انشا پردازوں نے ان دونوں سلطنتوں کے سایۂ عاطفت میں اس زبان کو بڑی ترقی دی۔

ہر طرح کے خیالات کا آئینہ بنا دیا یہاں تک کہ ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ تا ۹۶۵) نے اسے عوام کی بولی سے بڑھا کر سلطنت کی دفتری زبان اردو قرار دی۔ گولکنڈہ کے حکمراں بھی اس زبان میں اپنے بہت سارے آثار چھوڑ گئے۔ ۳؎

سلاطین آصفیہ شمالی ہند کی تمدنی اور شائستگی کی زبان اپنے ساتھ لائے لیکن وہ بھی بہت جلد اردو زبان کے اثرات سے مرعوب ہو گئے اور اسکی سرپرستی کو اپنا منصب سمجھنے لگے۔ اس طرح

۲؎ دیکھئے ضمیمہ، ۳؎ عبدالقادر سروری۔ حیدرآباد میں علمی ترقی ص ۹۷

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں اردو کا تقریباً ایک صدی کا ساتھ ہے۔ نواب ارسطو جاہ۔ اعلیٰ حضرت سکندر جاہ مہاراجہ چندو لال اور شمس الامرانے اپنی سرپرستی سے اس کی تابناکی میں چار چاند لگائے۔ "مدرسہ شجاعیہ" موقوعہ جامع مسجد حیدرآباد اور مدرسۂ فخریہ" اور مدرسہ دارالعلوم" میں یہی زبان تدریس و تفہیم کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔

"مدرسہ شجاعیہ" کے بانی نے کچھ رسالے متعلمین مدرسہ کے استفادہ کے لئے لکھے۔ "مدرسہ فخریہ" کے بانی و علم پرور نواب فخر الدین خاں شمس الامرا نے خود اپنے قلم سے اس کا ثبوت چھوڑا ہے۔ ان کا علمی شغف اس درجہ تھا کہ بیرون ہند بھی ان کی علمی سرگرمیوں کا چرچا تھا۔ انہوں نے حکمت ہندسہ، ریاضی وغیرہ میں سب سے پہلے اردو میں کتابیں لکھوائیں اور خود بھی تصنیف کیں۔ ان کی تعداد (۳۰) تک پہنچتی ہے۔ اپنی مساعی سے فنون ریاضی و علوم طبیعی کو یوروپین زبانوں سے اردو میں منتقل کروایا۔ جن میں "ستہ شمسیہ" بہت اہم ہے جو (۶) انگریزی رسالوں کے ترجمے ہیں۔ ریاضی کی کتابوں میں جر ثقیل۔ رسالہ کسورات اعشاریہ اور رسالہ اسطرلاب کروی قابل ذکر ہیں۔ رسالہ کیمسٹری پہلے آگرہ میں چھپا پھر حیدرآباد کے طالب علموں کیلئے یہاں دوبارہ چھپوایا۔ ان کتابوں کی اردو زبان شمالی ہند کی کتابوں کے مقابل میں سادہ سلیس اور عام فہم ہے شمس الامرا نے انگریزی اصطلاحات کے ترجمے بھی اردو میں کروائے تھے۔ ان کتابوں کے سرورق پر کچھ اس قسم کی عبارتیں نظر آتی ہیں۔

" اصول علم حساب اردو زبان میں اہل فرنگ کے دستور پر۔ نوسکھوں کیلئے۔

" رسالہ کسورات اعشاریہ اردو زبان میں تعلیم طلبہ کیلئے" [۱]

ناصر الدولہ کے عہد حکومت نے سب سے پہلے جو مدرسہ طبابت حیدرآباد میں قائم کیا تھا وہ ڈاکٹری جیسے علمی فن کی تعلیم اردو میں دیتا تھا۔ لقمان الدولہ ڈاکٹر عبدالحسین اور ارسطو یار جنگ جیسے قابل ماہرین اسی تعلیم کی پیداوار ہیں۔ تب اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصف سادس کے دور حکومت میں نہ صرف یہ کہ اردو زبان دفتری و سرکاری زبان قرار دی گئی بلکہ اس دور میں اردو اہل قلم کی جو سرپرستی ہوئی اور جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں ان سے اردو کا دامن اور وسیع ہوگیا۔

اعلیحضرت میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہی ۱۳۳۲ھ میں" انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم"

---

[۱] . حمید الدین شاہد ـــ اردو میں سائنسی ادب ص۸۱

قائم ہوئی۔ اس انجمن کے جملہ ارکین اردو کے اچھے انشاء پرداز و شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی اردو تصانیف و تالیف سے حیدرآباد کے ذخیرہ اردو میں قابل لحاظ اضافہ کیا۔ بعد میں جب "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" قائم ہوئی تو اس نے بھی خانگی سلسلۂ تالیفات اردو قائم کر کے ملک میں اپنی نظیر قائم کی۔ اس انجمن نے سلسلۂ تالیفات اردو کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے قابل ذکر کارناموں میں اسکی (۱۰۸) مطبوعات ہیں۔ اسی طرح "مجلس اشاعت العلوم" نے بھی بہت اہم کام کئے۔ (۶۰) کتابیں لکھوائیں جن کے موضوعات گوناگوں مثلاً فلسفہ حکمت، اصول و عقائد، حدیث و تفسیر اور قانون وغیرہ تھے۔ اس انجمن کے بانی نواب فضیلت جنگ (مولوی انوار اللہ) تھے جن کی خود اپنی تصانیف بھی قابل قدر ہیں۔

حیدرآباد کی تعلیم کے لئے ایک صدی سے زیادہ کی یہ ایسی تاریخ ہیکہ اس کے موجود ہوتے ہوئے جامعہ میں فطرتاً کوئی دوسری زبان ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکتی تھی۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی، ماحول بالکل تیار تھا۔ چنانچہ اس بیان کی تائید جامعہ عثمانیہ کے قیام سے بہت پہلے دارالعلوم کے فارغ التحصیل محمد مرتضیٰ کے اس بیان سے ہوتی ہے۔

> ابنائے ملک اس وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان (اردو) کو تازہ رکھیں یہ وہ دکن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو کی ضرورت سمجھی اور آصفجاہ سادس کے دور میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان بنگئی" اس بنا پر حیدرآباد اردو کا اصل مرکز ہو سکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اسمیں مضمر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے"۔

اگر اردو کے لئے اس طرح زمین ہموار نہ ہوتی تو اردو جامعاتی زبان کا درجہ اس کامیابی سے حاصل نہیں کر سکتی تھی جس کامیابی سے اس نے حاصل کیا

جامعہ عثمانیہ کی تاسیس

ایک اجنبی زباں میں علم بے پناہ قید تھا
تو تو نے ایک پل میں اس کو دام سے رہا کیا

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے مفکرین ملک، ماہران تعلیم اور عہدہ داران تعلیمات کے ذہن میں حیدرآباد کیلئے ایک جامعہ کا خیال اور اس کے اجزائے ترکیبی کا خاکہ بن چکا تھا جو مختلف اپیلوں اور تحریکات کی صورت میں ملک کے ارباب مقتدر کے سامنے لایا جاچکا تھا۔ اب اس خیال کو خاکہ اور اس تحریک کو شکل دینے اور عملی جامہ پہنانے کی ضرورت تھی اور کسی روشن خیال سرپرست اور ہوشیار معمار کے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی

آصف سابع شاہ عثمان کے عہد حکومت کے ابتدائی چند سال انتظامات سلطنت اور تعلیمی کشمکش کے مشاہدے میں گزرے۔ ملک کے تعلیمی نظام کی صورت گری میں ایک دہائی لگی اور اس سعی کے دوران ایک صحت بخش نظام تعلیم کے تصور کو نشوونما سے ہم آہنگ کیا گیا۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں اس زمانے کے معتمد تعلیمات سر حیدر نواز جنگ نے معمار اول ہونے کی حیثیت سے پہلی خشت رکھنے کا کام کیا۔ ملک کی تعلیمی ضروریات کے متعلق متعدد تحریکات کی روشنی میں ایک مفصل عرضداشت مرتب کرکے بارگاہ اعلیحضرت میں ۱۹۱۷ء م ۱۳۲۶ء میں پیش کی۔ اس عرضداشت میں مروجہ مجالس تعلیم کے اثرات تفصیل سے دکھلائے گئے تھے۔ ہندستان اور بیرون ہندستان کے اکابرین کی آرا بھی اس میں شامل تھیں۔ اس میں ممالک محروسہ کیلئے ایک جامعہ کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی جو ملک ہی کی ایک زبان یعنی اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے۔ اس کے ملاحظہ کے بعد اعلیحضرت نے منظوری کا فرمان جاری کیا (عرضداشت اور یادداشت فرمان کے متن ضمیمہ میں شامل ہیں) فرمان کے بموجب محکمہ تعلیمات کے ارباب بست وکشاد نے بہت جلد ذیلی امور کا تعین کرلیا اور آخرکار ۱۹۱۸ء میں ایک منشور خسروی صادر ہوا۔ تفصیلات سے درگزر کرتے ہوئے اس کا ضروری اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"چونکہ مابدولت اقبال کو اپنی عزیز وفادار رعایا کی فلاح و بہبود بدرجہ اتم مدنظر ہے

اور مقصد اعلیٰ صرف اس صورت میں بوجہ احسن حاصل ہو سکتا ہے جبکہ موجودہ انتظام تعلیم ممالک محروسہ سرکاری عالی کو بیرونی جامعات سے مناسب حد تک آزاد و مستثنیٰ کرکے اعلیٰ انتظام ملکی خصوصیات و حالات کے اعتبار سے خود اندرون ملک کیا جائے اور مابدولت واقبال حکم فرماتے ہیں کہ

۱۔ حیدرآباد دکن میں ایک جامعہ (یونیورسٹی) بنام جامعہ عثمانیہ محرم الحرام ۱۳۳۷ھ سے قائم کی جائے

۲۔ جامعہ عثمانیہ کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی، اخلاقی، ادبی، فلسفی، طبعی، تاریخی، طبی، قانونی، زراعتی، تجارتی، اعلیٰ تعلیم کا اور دیگر علوم وفنون وسود مند پیشوں اور صنعت وحرفت وغیرہ سکھلائے اوران سب میں تحقیقات وترقیات کا انتظام کرے۔

۳۔ جامعہ عثمانیہ کی خاص خصوصیت یہ ہوگی کہ جملہ علوم کی تعلیم زبان اردو میں دیجائیگی اور اس کے ساتھ انگریزی زبان وادب کی تعلیم لازمی ہوگی وغیرہ " [۱]

اس منشور میں تفصیل کے ساتھ جامعہ عثمانیہ کے اختیارات بیان کئے گئے ہیں۔ پھر اس کی ہئیت ترکیبی کا ذکر ہے۔ اس طرح حسب منشور خسروی جامعہ عثمانیہ یکم محرم ۱۳۳۷ھ سے قائم ہوگئی لیکن اسکی باضابطہ تعلیم کا آغاز ۱۷ اگسٹ ۱۹۱۹ء ماہ ہجری ۱۳۳۷ھ سے ہوا۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح ۲۸ اگسٹ ۱۹۱۹ء آغا محمد حسن کے مکان واقع توپ کا سانچہ ہوا۔ اس تقریب میں عمائدین، حکام اور معززین کے علاوہ طلبا کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ جبیب الرحمن شروانی (صدر یار جنگ) نے جلسہ کی صدارت فرمائی، حیدر نواز جنگ معتمد عدالت وتعلیمات نے فرمان مبارک پڑھکر سنایا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی یہی مبارک ساعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی محکمہ تعلیمات کے عہدہ داروں نے جامعہ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ابتدائی امور کا سرانجام شروع کیا۔ نئی جامعہ کی ہئیت مدون کی گئی۔ نصاب مرتب کرنے کے لئے کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ نصاب کے جو مسودے تیار ہوئے اس سے ارباب جامعہ نے اتفاق کیا اور جامعہ کی اسکیم نافذ ہوگئی۔

جامعہ عثمانیہ کے پہلے معین امیر جامعہ نواب صدر یار جنگ ہوئے اور جامعہ کی صدارت کے فرائض پہلے مہدی یار جنگ کے سپرد کئے گئے اور پھر مسعود جنگ (سرراس مسعود)، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

---

[۱] ۔ ڈاکٹر زور ۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ص ۹۲، ۹۳

اور محمد عبدالرحمٰن خاں یکے و دیگرے اس کے صدر مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد صدر کلیہ کے بجائے ایک پرو وائس چانسلر کا عہدہ قائم کیا گیا جس پر ڈاکٹر میکنزی اور پھر قاضی محمد حسین فائز ہوئے ۔ پھر یہ عہدہ وائس چانسلر میں تبدیل کیا گیا جس پر اعظم جنگ ' علی یاور جنگ اور ڈاکٹر رضی الدین یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے ۔ [۱]

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس عظیم الشان تحریک کو عملی جامہ پہنانے اور اس کو ہر طرح کامیاب بنانے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مقدم اور ضروری تھی اور جس پر یونیورسٹی کی تعلیم کا دار و مدار تھا وہ دیگر زبانوں کے علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کا کام تھا ۔ جامعہ کا ذریعہ تعلیم چونکہ اردو زبان کو قرار دیا گیا اس لئے تاسیس جامعہ کے ساتھ دیگر زبانوں کے سائنسی علوم کی کتابوں کے ترجمے کیلئے ایک شعبہ سررشتہ تراجم و تالیف قائم کیا گیا جو دارالترجمہ کے نام سے موسوم ہوا ۔ اس کے ساتھ ہی دارالترجمہ کی مجالس وضع اصطلاحات کا قیام بھی عمل میں آیا جس کی تفصیلات آئندہ صفحوں میں پیش ہیں ۔

جامعہ عثمانیہ کے شعبہ جات

جامعہ عثمانیہ میں مختلف قسم کی تعلیم کے جن شعبوں کا قیام عمل میں آیا ان کی تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے شعبوں کے نام اور ان کے تحت کام کرنے والے ذیلی شعبوں کی فہرست پر اکتفا کیا جا رہا ہے ۔ اس سے جامعہ میں دی جانے والی تعلیم کے پھیلاؤ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

۱۔ شعبہ جات فنون

جامعہ کے شعبہ جات فنون حسب ذیل تھے ۔

۱۔ انگریزی ۔ انگریزی ادب کی تعلیم ہر شعبہ کے طالب علم کیلئے لازمی تھی

۲۔ السنہ اردو ۔ اردو ادب کی تعلیم اختیاری تھی ۔

۳۔ فارسی ۔

۴۔ سنسکرت ۔

۵۔ تلنگی ۔ مرہٹی ۔ کنڑی

۶۔ معاشیات

---

[۱] ۔ داستان ادب حیدرآباد ۔ ڈاکٹر زور ص ۱۸۹

۷۔ تاریخ ۔

۸۔ فلسفہ ۔

۹۔ دینیات : دینیات لازمی ان سارے طلبا کیلئے جو حنفی عقائد کے تھے لازمی تھی۔ شیعہ اور ہندو طلبار کے لئے اس کے بجائے اخلاقیات کی تعلیم ضروری تھی۔

۱۰۔ قانون ۔

۱۱ تجارت ۔

۱۲۔ جغرافیہ

۱۳۔ سیاسیات

۱۴۔ تدریس

جامعہ کے شعبہ جات سائنس

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی اس کے شعبہ جات قائم ہو گئے جو حسب ذیل تھے ۔

۱۔ ریاضی ۲۔ طبعیات ۳۔ کیمیا ۴۔ حیاتیات

۵۔ نباتیات ۶۔ حیوانیات ۷۔ معدنیات ۸۔ علاج حیوانات ۹۔ زراعت

۱۰۔ انجینیری ۔ ۱۔ سیول انجینیری ۲۔ میکانیکل انجینیری ۳۔ الکٹریکل انجینیری

۱۱۔ طب ۔

۱۔ عضویات ۲۔ تشریح الابدان ۳۔ علم الادویات

۴۔ علم تشخیص امراض ۵۔ طب ۶۔ جراحت ۔

۷۔ زچگی و امراض مستورات ۸۔ امراض چشم

جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں

کسی جامعہ کے لئے اسکی عمارتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں جو درس وتدریس کا مرکز ومحور ہوتی ہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا خیال تنہا منفرد تھا اسی اعتبار سے اس کے لئے ایک ایسی عمارت بنانے کا خاکہ پیش نظر ہوا جو یگانہ روزگار ہو۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی اسکی عمارات کے لئے جگہ کے انتخاب کا کام بھی شروع ہوا۔

ابتداء میں کالج کی عمارتیں توپ کے سانچے (آغا منزل) میں تھیں جہاں اب حیدرآباد اسٹیٹ بنک ہے اور اس کے روبرو اعظم جاہی ملز کا دفتر ہے۔ رہائشی طلبہ کے لئے ان عمارتوں کے قریب مسرت منزل اورکرسنٹ منزل کی عمارتیں ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ جب یہ ناکافی ہوئیں تو کچھ دورکنگ کوٹھی روڈ پر نظامت منزل اور رام کوٹ میں فرحت منزل کو لینا پڑا۔ ان میں آرٹس کالج کی عمارت کو فوقیت حاصل ہے۔ عام طور پر لوگ آرٹس کالج ہی کو جامعہ عثمانیہ خیال کرتے ہیں اور اس عمارت کو جامعہ عثمانیہ کی عمارت۔ دوسری عمارتیں رفتہ رفتہ تعمیر ہوئیں۔ ان میں سابقہ تعمیر کردہ دو اقامت خانوں کے علاوہ جدید اقامت خانے شعبہ طبعیات، کیمیا، نباتیات وحیوانیات انجینیرنگ کالج۔ لا کالج۔ کالج آف اگریکلچر کی عمارتیں شامل ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی عمارتوں کے لئے اڈی کمیٹ کی پہنائے بسیط حاصل کی گئی۔ جن انجنیروں نے جامعہ کے لئے یہ جگہ انتخاب کی تھی ان کی داد دینا چاہیئے۔ جامعہ کے لئے اس سے موزوں کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔ رنگ روپ کے علاوہ اڈی کمیٹ میں پچھلی صدیوں کی کچھ تاریخ بھی ہے۔

یہ سید مظفر کی جاگیر تھی جو آخری قطب شاہی زمانے کا سرنوبت ومیر جملہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی نے ۱۲۷۲ء میں تاناشاہ کو تخت نشین کیا تھا لیکن بعد میں جب سید مظفر نے بادشاہ سے بے وفائی کی اور مغلوں سے جا ملا تو جاگیر اس سے بازگشت کرالی گئی اور پھر جب مہ لقا بائی چندہ کی حسن وجوانی اور شاعری کا چرچا ہوا تو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اڈی کمیٹ کو مہ لقا بائی کی جاگیر بنادیا گیا چنانچہ موجودہ

آرٹس کالج کی عمارت کے پیچھے مہ لقابائی کی بارہ دری اب تک قائم ہے

۱۹۳۴ء میں یونیورسٹی کی منتقلی شہر کے منتشر مقامات سے اڈہ کمیٹ کیمپس میں عمل میں آئی لیکن کیمپس کی مستقل اور منصوبہ بند عمارتوں کی تعمیر تک کئی لاکھ روپیے کے صرفہ سے عارضی عمارتیں تعمیر کرنی پڑیں۔

یونیورسٹی کیمپس (جو ۱۶۰۰ ایکڑ پر مشتمل ہے) کا پلان شاہانہ نوعیت کا تھا۔ اڈی کمیٹ کی یہ وسیع و عریض زمین حاصل ہوجانے یعنی جگہ کا انتخاب ہو جانے کے بعد عمارت کے نقشہ کی تیاری کے لئے حیدرآباد کے ماہر فن چیف انجینیروں سید علی رضا اور زین یار جنگ کو ۱۹۳۰ء میں "اسپشل بلڈنگ کمیٹی" کے فیصلہ کے مطابق عالمی دورہ پر بھیجا گیا۔ اس دورہ کا مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات دنیا کے تمام عصری جامعات کی عمارتوں کا معائنہ کرکے جامعہ عثمانیہ کی عمارت کا ایسا خاکہ تیار کریں جو عصری ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی فنِ تعمیر کا امتزاج بھی رکھے۔

۱۹۲۱ء کو یہ حضرات امریکہ، جاپان، فرانس۔ جرمنی۔ انگلستان۔ مصر اور ترکی کی جامعات کا معائنہ کرکے لوٹے۔ یہاں قطب شاہی دور کی عمارتوں اور بیدر کے عمارات شاہی، قدیم مندر غار ہائے ایلورہ اجنٹا، آگرہ، دہلی اور فتح پور سیکری کے عمارات کا جائزہ بھی لیا تاکہ نقشہ جات کی تیاری میں مدد مل سکے کہ ہندو اور اسلامی آرٹ کے ملاپ کا ایک نادر نمونہ پیش کیا جاسکے۔

آرٹس کالج کے نقشہ کی تیاری کے ساتھ سینٹ ہال اور لائبریری کے خاکے بھی تیار کیئے گئے ان عمارات کی تعمیر میں مختلف ادوار کے تعمیری کارناموں کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے۔ پہلی منزل کے ستون ایلورہ اجنٹا سے ماخوذ ہیں۔ دوسری منزل کی کمانیں' قرطبہ کی کمانوں سے نقل کی گئی ہیں اور عرب فن تعمیر کی کمانوں اور پتلے پتلے ستونوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی کے مشہور آرکٹیکٹ نواب زین یار جنگ کی نگرانی میں پہلی عمارت آرٹس کالج تیار ہوئی جو خوبصورت ستونوں اور ایلورہ اجنٹا کے اسٹائل کے ساتھ نظر نواز ہند المانی طرز تعمیر کی موجودگی کی وجہ سے ایک خوشگوار امتزاج کا اظہار کرتی ہے۔

آرٹس کالج کی عمارت ۱۹۳۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے افتتاح کے بعد ہی اکثر شعبے عارضی عمارتوں سے یہاں منتقل ہوگئے۔ اس عمارت کے کچھ عرصہ قبل دو وسیع اور دلکش اقامت خانوں کی تعمیر بھی ہوئی جن میں اقامت خانہ (ب) مثلی شکل میں ہے۔

سلطان العلوم کی اعزازی ڈگری : تاسیس جامعہ عثمانیہ کے کچھ عرصہ بعد حضور نظام کو اعزازی ڈگری دینے کی اولین تحریک شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا نے سر علی امام صدر اعظم کے آخری زمانے میں بارگاہ اقدس میں پیش کی۔ اس پر کوئی پیشرفت نہ ہوئی اور انہیں تحریری جواب ملا کہ قواعد جامعہ عثمانیہ میں ابھی تفصیلی امور طے شدنی ہیں۔ جناب ولا نے ۲۵ جنوری ۱۹۲۳ء کو اپنی سابقہ تحریک کا اعادہ کرتے ہوئے راست اعلیٰحضرت کی خدمت معروضہ پیش کیا اس میں لکھا۔

"جامعہ عثمانیہ حضرت اقدس و اعلیٰ کی علم دوستی اور فضیلت پناہی سے قائم ہوئی ہے لہذا اس کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ بارگاہ سلطانی میں" حکیم الادب" کی ڈگری باادب پیش کرے" اس تحریک کے آخر میں لکھا تھا کہ سرکار اس عرضی کو اپنی اجازت کے ساتھ نواب سر فریدون الملک صدر اعظم کے پاس روانہ فرمادیں تو جامعہ عثمانیہ میرے مالک کی اس سالگرہ مبارک کی تقریب میں جو ماہ آئندہ میں ہے حکیم الادب کی ڈگری پیش کرے گا اور اس علمی ڈگری کا بجا لطف اہل علم کو حاصل ہوگا۔

اس درخواست پر پیشی ہمایوں سے یہ ارشاد ہوا کہ

" چونکہ یہ معاملہ میری ذات سے تعلق رکھتا ہے لہذا میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مگر یہ حکم دیتا ہوں کہ اس بارے میں محمد احمد صاحب صدر الصدور اور صیغہ متعلقہ کی رائے کے ساتھ باب حکومت کی رائے بھی لی جائے کہ عزیز جنگ کی تحریک کہاں تک قابل قبول ہے"

محمد احمد صاحب مفتی عدالت اور جناب صدر الصدور صاحب نے اس تحریک سے اتفاق کرتے ہوئے ایک مراسلہ[1] (مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۲۳ء) کے ذریعہ معتمد صاحب عدالت و کوتوالی و امور عامہ کو لکھا کہ نواب عزیز جنگ کی عرضی کے بارے میں معجل صاحب جامعہ عثمانیہ سے تبادلہ خیال کیا۔ کون شخص اس سے بے خبر ہے کہ خسرو دکن کی ذات منبع فیوض علم و ادب ہے۔ حکیم الادب" کی ڈگری کا نذرانہ ایک حقیر تحفہ ہوگا۔ پیشگاہ خسروی سے اجازت شرف صدور لائے تو جامعہ عثمانیہ کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہوگا۔

صدر یار جنگ نے بھی اس تحریک سے اتفاق کیا کہ دنیا کی نامور یونیورسٹیاں بادشاہوں کو

---

[1] ۔ دیکھئے ضمیمہ ص

اعزازی ڈگریاں دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اعلیحضرت کی خدمت میں قدردانی و ہنر پروری کا اعتراف عین حق ہے ف۱

بعدازاں یہ مسئلہ مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ میں پیش ہوا اور بالاتفاق یہ قرار پایا کہ چونکہ یہ جامعہ حضرت جہاں پناہی کی ساختہ و پرداختہ ہے لہٰذا اس کے لئے بطور خود ڈگری پیش کرنا سوءِ ادب ہے البتہ اگر خاطر اعلیحضرت بندگان عالی اس امر کی جانب مائل ہو کہ جامعہ عثمانیہ کی ڈگری کو شرف قبول فرما کر اسکی عزت افزائی فرمائی جائے تو بجائے ان معمولی ڈگریوں کے جو جامعہ عثمانیہ دیگر اشخاص کو عطا کرسکتی ہے ایسی ڈگری کی تجویز پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے جو ذات اقدس و ہمایوں تک محدود و مختص ہو۔

معزز باب حکومت نے بھی مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کی اس رائے سے اتفاق ظاہر کیا اور حسبہٖ پیشی خداوندی میں عرضداشت پیش ہونے پر یہ حکم محکم شرف صدور لایا۔

" پہلے تجاویز پیش کرنے کیلئے مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کو حکم دیا جائے "

چنانچہ یہ اہم مسئلہ مجلس اعلیٰ کے اجلاس منعقدہ ۲۷/ امرداد ۱۳۴۲ف میں پیش ہوا اور بالاتفاق قرار پایا کہ خطابات ذیل تجویز کئے جائیں اور ان میں سے جو پسند خاطر ہو بعد منظوری خداماں اعلیحضرت بارگاہ خسروی میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی جائے۔

۱. شمس المعالی

۲. حکیم السیاست

۳. سلطان العلوم

حسبہٖ درخواست گزرانی گئی یہ حکم صادر ہوا کہ

" سلطان العلوم کی ڈگری مناسب ہے۔ کسی دن میں خاص طور سے جامعہ عثمانیہ آؤنگا اسی ماہ کے اواخر میں دن تاریخ ٹھہرا کر اس وقت ڈگری پیش کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا اور اس ڈگری کو طلائی حروف میں تراش کر قطعہ کی صورت میں پیش ہو تو یہ بطور یادگار میرے یہاں رہے گی۔ اس کے نیچے سنہ و تاریخ درج رہے جس دن کہ مجھے

ف۱ دیکھئے ضمیمہ ص

دی جائے ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے دئیے جانے کے بعد اس کا ذکر
ہندستان کے اخبارات میں طبع کرا دیا جائے ۔"

فرمان مبارک کے شرف صدور لانے پر مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کا ایک خاص اجلاس ضروری انتظامات کے لئے منعقد ہوا ۔ جس میں امور انتظامات کو قطعیت دی گئی ۔ طے ہوا کہ ایڈریس کا مسودہ نواب اکبر یار جنگ بہادر بھی دیکھ لیں [۱]

یادداشت مذکورۂ بالا کے لحاظ سے مسودہ عرضداشت مرتب ہوکر خدمت حضرت اقدس و اعلیٰ میں پیش ہوا اور منظوری حاصل ہوئی ۔

اس کے بعد ۵ آبان م ستمبر ۱۹۲۳ء کو نواب اکبر یار جنگ رکن مجلس رفقاء و معتمد مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے رزولیشن پیش کیا کہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے "سلطان العلوم" کی اعزازی ڈگری کو شرف قبولیت بخشی ہے اس پر مجلس رفقاء اظہار تشکر و امتنان کرتی ہے [۲] بعد ازاں ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ایڈریس ہال باغ عامہ میں سلطان العلوم کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کی یہ تقریب عمل میں آئی ۔ اس میں حیدرآباد کے امراء و اعزہ سینیر عہدہ داران دیوانی و صرفخاص ۔ جاگیرداران و والیان سمستان شریک تھے ۔ ڈگری پیش کرنے پر اعلیٰ حضرت نے ایڈریس کا جواب دیا اور یہ تقریب اس لحاظ سے حیدرآباد کی تاریخ میں ایک یادگار تقریب ہوگئی ۔

---

[۱] دیکھئے یادداشت ضمیمہ صفحہ ، [۲] دیکھئے مراسلہ دفتر معتمد جامعہ عثمانیہ ضمیمہ صفحہ

دارالترجمہ اور اصطلاح سازی کا کام

تاسیس جامعہ عثمانیہ کے بعد اردو ذریعہ تعلیم کو عملی جامہ پہنانے اور اسکو ہر طرح کامیاب بنانے کیلئے جو چیز سب سے زیادہ اہم تھی اور جس پر اس یونیورسٹی کی تعلیم کا دار و مدار تھا وہ شعبہ تراجم و تالیف کا قیام تھا کیونکہ جملہ علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنا ضروری تھا لیکن یہ کام جس قدر ضروری تھا اسی قدر دشوار گزار بھی تھا۔ ہر شعبے کی کتابوں کے ترجمے کیلئے ایسے اہل علم کی ضرورت تھی جو اپنے شعبہ کے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی، اردو اور فارسی پر بھی کافی دستگاہ رکھتے ہوں۔ کتابوں کے ترجمے سے پہلے اصطلاح سازی کا کام بھی درپیش تھا چنانچہ اس عظیم مقصد کیلئے دارالترجمہ و تالیف جامعہ عثمانیہ وجود میں آیا۔

دارالترجمہ کے قیام سے قبل کی کوشش

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں یہ بات گزشتہ ابواب میں اختصار کے ساتھ سامنے آئی ہے کہ حیدرآباد میں جدید علوم و فنون کی کتابوں کے اردو ترجمہ کے کام کی بنیاد ایک صدی قبل پڑ گئی تھی۔ حیدرآباد کے ایک امیر کبیر نواب شمس الامرائے ثانی (نواب فخر الدین خاں بہادر) نے اس ضرورت کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی قائم کردہ درسگاہ "مدرسہ فخریہ" کیلئے کتابوں کے ترجمے بھی کروائے اور خود بھی کتابیں تصنیف و تالیف کیں یہ سلسلہ ان کے فرزندوں کے عہد تک قائم رہا۔ اس طرح ترجمہ کی ایک وقیع روایت سے استفادہ حاصل ہوا خانوادہ شمس الامرا کی سرپرستی میں (۵۰) سے زیادہ کتابیں ترجمہ ہوئیں اور لکھوائی بھی گئیں جن کا تعلق علوم و فنون کے مختلف شعبوں سے تھا۔ ریاضی، مساحت، علم ہندسہ، ہیئت، کیمیا، برق، تاریخ و جغرافیہ اور معدنیات وطب۔ ان میں سے اکثر انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے معیاری کتابوں کے ترجمے تھے۔ کتابوں کے نام کچھ اس طرح تھے رسالہ کیمسٹری، رسالہ الکٹریسٹی، اصول علم حساب، مفتاح الافلاک، علم جر ثقیل علم آب، رسالہ چیپک اور منتخب البصر وغیرہ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون کے اصطلاحات کے ترجمے کی کوششیں بھی کی گئی تھیں۔

اس سلسلے کی دوسری کوشش نواب سر وقار الامرا (اقبال الدولہ) کے عہد میں ہوئی۔ انہوں نے ایک سرکاری سررشتۂ علوم و فنون ۱۳۱۵ھ میں قائم کیا تھا۔ اس کا اہم مقصد مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف و تصنیف کی تیاری تھا۔ اس کام میں جنھوں نے حصہ لیا ان میں قابل ذکر سید علی بلگرامی مولوی کاظم علی اور مولانا شبلی کے نام ہیں۔ نگرانی سید علی بلگرامی کے سپرد تھی جنھوں نے اس کی ترتیب و تنظیم میں بہت دلچسپی لی۔ ان کے بعد یہ سررشتہ ایک عرصہ تک کاظم علی صاحب کے تحت کام کرتا رہا۔ آخرکار ۱۹۰۰ء میں مولانا شبلی اس کے ناظم بنائے گئے تو ان کی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے یہ سررشتہ سارے ہندستان میں مشہور ہوگیا۔ ۱۹۰۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد میں اس کارنامہ کا ذکر یوں ملتا ہے۔

"ہم شکر گذار ہیں حضور نظام کی اس سرپرستی اور شاہانہ عنایت کے کہ مثل خلفائے بنی عباس اس اسلامی ریاست نے بھی ایک محکمہ علوم و فنون کا قائم کیا ہے جس کے ناظم شمس العلوم مولوی شبلی نعمانی ہیں۔ اس محکمہ میں ایک مترجم کتب انگریزی کا ہے"[1]

اس سررشتہ کی بدولت انگریزی علوم و فنون کی کئی کتابوں کے اردو ترجمہ ہوئے۔ سلسلۂ آصفیہ کی ان مطبوعات نے اردو میں بعض اہم کتابوں کا اضافہ کیا۔

بعد ازاں جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی تو اس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں اردو میں علوم و فنون کے تراجم کی اشاعت کی تحریک رکھی اور سرکار نظام سے خواہش کی کہ بہترین علمی تراجم و تصانیف اردو پر انعامات دینے کیلئے امداد منظور فرمائی جائے۔ کانفرنس میں یہ تحریک مولوی عبدالحق صاحب نے پیش کی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے اس مطالبہ کی واجبیت کو تسلیم کیا اور اس سلسلے میں نصاب کی کتابوں کے ترجمے کا کام انجمن ترقی اردو کے تفویض کردیا۔

اس کے دوسرے ہی سال جامعہ عثمانیہ کے قیام کیلئے جو عرضداشت پیش کی گئی تھی اس میں دارالترجمہ کے قیام کے متعلق یہ صراحت تھی

• ایک شعبہ تالیف و تراجم کا قائم کیا جائے جو مغربی زبانوں سے اعلیٰ درجہ کی تصانیف کا ترجمہ کرسکے اور ضروری مباحث پر عمدہ تالیفات کا انتظام کرے اور ان کے ذریعہ ملک میں اعلیٰ خیالات اور معلومات کی اشاعت کرے تاکہ اس شعبہ کی بدولت ہماری زبان میں ایسا سرمایہ

---

[1] روداد کانفرنس ص ۲۶۳

مہیا ہو جائے جو یونیورسٹی کی ضرورت کو پورا کر سکے"۔ سلہ
دارالترجمہ کا قیام دراصل جامعہ عثمانیہ کے تاسیس کی پہلی کڑی تھی۔ عرضداشت میں دارالترجمہ کی ضرورت کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔

" علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے اور ملک میں اشاعت علم و ہنر کی یہ پہلی کوشش ہوگی جو بڑے پیمانے پر اس ملک میں سرکار عالی کی جانب سے کی جائے گی اور جسکے فوائد اور منافع نسل بعد نسل زمانۂ دراز تک ملک کو پہنچیں گے اور بلحاظ افادہ و اہمیت و ضرورت یہ کام علمی دنیا میں ایسا ہوگا جسکی نظیر تمام ہندستان میں نہیں پائی جاتی "۔ سلہ

چنانچہ یونیورسٹی کے قیام کی منظوری کے ساتھ ہی (۱۳ اگسٹ ۱۹۱۷ء) ایک سررشتہ تالیف و تراجم قائم کر دیا گیا۔ دارلترجمہ کی عرضداشت میں کام کی نگرانی کے تعلق سے یہ تحریک تھی کہ اس شعبہ کی نگرانی و انتظام کیلئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علاوہ زباندان ہونے کے اردو کا مسلم انشاپرداز بھی ہو۔ نظر تحقیق و تنقید بھی رکھتا ہو۔ ترجمہ کے فن اور اسکی مشکلات سے واقف ہو۔ اس تمہید کے بعد تحریک یہ کی گئی کہ اس خدمت کے لئے مولوی عبدالحق سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ بعد منظوری سررشتہ تالیف و تراجم کی نظامت عبدالحق صاحب کے تفویض کر دی گئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارلترجمہ میں پہلے صرف مغربی زبانوں ہی کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام تھا اس لئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے تیسرے اجلاس میں یہ توجہ دلائی۔

" اس سررشتہ (دارالترجمہ) کے متعلق جیساکہ ریزولیوشن سرکاری عالی شائع شدہ سے واضح ہوتا ہے فی الحال صرف علوم مغربیہ کی تالیف و تراجم کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس اہم کام کے ساتھ علوم مشرقیہ یا دوسرے الفاظ میں عربی، فارسی اور سنسکرت میں جو علوم و فنون کے ذخیرے ہیں ان کے اصل ماخذوں سے اردو میں تالیف و ترجمہ کے ذریعہ اضافہ کیا جائے"۔

کانفرنس کی اس تحریک کا ہی نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ دارالترجمہ میں عربی اور فارسی کے تراجم کا بھی انتظام کیا گیا اس مقصد کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی اس میں حسب ذیل اصحاب کو بحیثیت رکن دارالترجمہ شامل کیا گیا۔

سلہ سلہ : سرگزشت جامعہ عثمانیہ - بدر شکیب ص ۲۱۱، ۲۱۴

قاضی محمد حسین، چودھری برکت علی، سید ہاشمی فرید آبادی، محمد الیاس برنی، قاضی تلمذ حسین، ظفر علی خاں عبدالماجد، عبدالحلیم شرر، سید علی رضا، عبداللہ العمادی ۔

حیدر یار جنگ طباطبائی ترجموں پر نظر ثانی کیلئے مقرر تھے ۔ ناظر ادبی کی خدمت شبیر حسن خاں جوش کے سپرد تھی ۔

دارالترجمہ کے مترجمین کے انتخاب کیلئے سارے ہندستان پر نظر ڈالی گئی اور خوب سے خوب تر کے اصول پر بہترین اصحاب کو حیدرآباد طلب کیا گیا کیونکہ ترجمہ کیلئے ایسا ہی آدمی موزوں ہو سکتا تھا جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی زبان کے علاوہ اردو اور فارسی پر مکمل قدرت رکھتا ہو اور صاحب قلم بھی ہو تاکہ اعلیٰ علمی خیالات کو دوسری زبانوں سے بطریق احسن شستہ اور صاف اردو میں ادا کر سکے اور طلبا ان سے استفادہ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ کریں ۔[1]

کتابوں کے ترجمے کا طریقہ یہ تھا کہ جامعہ کی مختلف مجالس نصابی اپنی ضرورت کی کتابیں منتخب کرتی تھیں اور مجالس اعلیٰ سے منظوری حاصل کرنے کے بعد ان کی یہ تحریک دارالترجمہ کو روانہ کر دی جاتی تھی۔ دارالترجمہ میں دو قسم کے مترجم تھے داخلی اور بیرونی۔ یعنی ایک وہ جو خود محکمہ کے رکن تھے اور دوسرے میں بیرونی اصحاب جن میں زیادہ تر کلیات کے پروفیسر اور ماہرین تھے ۔ جو مترجم رکن دارالترجمہ تھے وہ فلسفہ، سیاسیات تاریخ، معاشیات، قانون، ریاضی اور طب کا ترجمہ کرتے تھے ۔ باہر کے مترجمین کو بالعموم طبیعات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، انجینیری اور تعلیم المعلمین کی کتابیں ترجمہ کو دی جاتی تھیں ۔ مکمل ترجمہ کے بعد نظر ثانی کیلئے یہ کتابیں جامعہ کے مقرر کردہ ناظر کے پاس بھجوادی جاتی تھیں ۔ نظر ثانی اور مذہبی و ادبی نقطہ نظر سے جانچ پڑتال ہو چکنے کے بعد مسودہ مطبع کو روانہ کر دیا جاتا تھا[2] مترجمین جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے برصغیر کی ایسی عظیم شخصیتیں تھیں جو اپنے فن میں [illegible] تھیں ۔

دارالترجمہ کے ابتدائی ارکان کی جو فہرست تیار کی گئی اس میں حسب ذیل ناموں کی شمولیت تھی ۔

مولوی عبدالحق (ناظم)، قاضی محمد حسین (مترجم ریاضیات)، چودھری برکت علی (مترجم سائنس) سید ہاشمی فرید آبادی (مترجم تاریخ)، محمد الیاس برنی (مترجم معاشیات)، قاضی تلمذ حسین (مترجم سیاسیات) ظفر علی خاں (مترجم تاریخ)، عبدالماجد (مترجم فلسفہ و منطق) عبدالحلیم شرر (مولف تاریخ اسلام)، سید علی رضا (قانون)

---

[1] بہ شکیب ۔ سرگزشت جامعہ عثمانیہ ص ۲۱۲ [2] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ۔ ڈاکٹر زور ص ۱۱۱

عبداللہ عمادی (کتاب عربی)، حیدر یار جنگ نظم طباطبائی (ناظر: جو ترجموں پر نظر ثانی کرتے تھے)

قاضی محمد حسین ریاضی میں رینگلر تھے۔ ریاضی میں کل ہند شہرت رکھتے تھے۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر بھی تھے اور ریاضی کے پروفیسر بھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ترجمہ کا کام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے ریاضیات اور انجینئرنگ سے متعلق (۱۶) کتابیں اردو میں منتقل کیں' چودھری برکت علی حیدرآباد آنے سے پہلے علی گڑھ میں سائینس کے مسلمہ استاد تھے اور اردو میں سائینس کی تعلیم کو عام کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں کلیہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے۔ طبعیات اور کیمیاء سے متعلق (۱۴) کتابیں لکھیں۔ عبدالماجد دریابادی اردو کے مایہ ناز انشا پرداز تھے۔ عالم وقت کہلاتے تھے۔

فلسفہ اور نفسیات پران کی اردو کتابیں غیر معمولی شہرت کی حامل ہیں۔ سید ہاشمی فریدآبادی ابتداء میں مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اردو میں کام کر چکے تھے۔ تاریخی مضامین کی تالیف و ترتیب کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ دارالترجمہ کیلئے انہوں نے (۱۴) کتابیں ہندستان اور یوروپ کی تاریخ سے متعلق لکھیں۔ قاضی تلمذ حسین الہ آباد یونیورسٹی کے ایم۔ اے تھے گورنمنٹ کالج جبلپور کے عربی و فارسی کے پروفیسر اور ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کے صدر بھی رہ چکے تھے۔ علم السیاسیات کے مترجم تھے۔ انہوں نے تاریخ اللسان، تاریخ یوروپ اور دستور سیاست سے متعلق (۲۳) کتابیں ترجمہ کیں۔

مترجمین کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں ایک سو سے زیادہ برصغیر ہند کے چوٹی کے عالم شامل تھے جنکے نام ہی اس بات کی ضمانت ہیں کہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کیلئے ہندستان کے بہترین علماء کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔

مترجمین دارالترجمہ کے چند قابل ذکر نام حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین، مناظر احسن گیلانی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر عبدالرحمن مرزا محمد ہادی رسوا۔ ڈاکٹر میر وحیدالدین، ہارون خاں شیروانی' محمد عنایت اللہ دہلوی۔ مولانا ظفر علی خاں علی حیدر طباطبائی، پروفیسر کشن چند' غلام یزدانی' رشید احمد صدیقی' پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر یوسف حسین خاں' غلام ربانی' نجیف اشرف ندوی' پروفیسر حبیب الرحمن' ڈاکٹر عابد حسین سجاد مرزا' ڈاکٹر محمد حمید اللہ' ڈاکٹر شاہنواز' ڈاکٹر غلام دستگیر' ڈاکٹر حیدر خاں ڈاکٹر خورشید حسن' ڈاکٹر میر سیادت علی وغیرہ

جن مترجمین نے کام کیا ہے ان میں سے اکثر کا تعلق بیرون دکن سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان

کے سارے دانشور اور اردو کے بہی خواہوں نے مشترکہ طور پر جامعہ کے اس انوکھے تجربے کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔

مجلس وضع اصطلاحات

یورپی علوم وفنون کی مستند کتابوں کے اردو ترجمہ کیلئے جب دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو اسکے ساتھ ہی ترجمہ کے کام کو علمی طور پر آگے بڑھاتے اور اس میں سہولتیں پیدا کرنے کے لئے "مجلس وضع اصطلاحات" بھی قائم ہوئی۔

اردو زبان میں سائنسی علوم کی تعلیم کیلئے سب سے مشکل منزل علمی اصطلاحوں کی ہے۔ دیگر زبانوں کی اصطلاحوں کو جوں کا توں نہیں رکھا جا سکتا۔ سنسکرت یا عربی کی اصطلاحیں بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اصطلاحیں ایسی ہونی چاہئے تھیں جو طلبا کیلئے سریع الفہم ہوں نیز جس مفہوم کیلئے وہ وضع کی جائیں اسکو ادا کر سکیں۔ اس کام کیلئے لسانی اصولوں سے بھی واقفیت ضروری تھی اور رواداری کے ساتھ ہر زبان سے استفادہ کرنا لازم تھا چنانچہ اسی مقصد کیلئے دارالترجمہ کے ایک شعبہ کے طور پر مجلس وضع اصطلاحات بھی وجود میں آئی۔

مجلس وضع اصطلاحات کا کام زبان کی موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے ہر شعبۂ فنون کیلئے اصطلاحیں وضع کرنا تھا چنانچہ طبیعات، کیمیا اور ریاضیات کیلئے ایک مجلس قائم ہوئی اور فنون کیلئے دوسری، آگے چل کر جب حیاتیات، طب اور انجینیرنگ کے شعبے کھولے گئے تو ان کیلئے علحدہ مجلسیں قائم کی گئیں۔ ہر علم وفن کے مسائل چونکہ جدا جدا ہوتے ہیں اس لئے مختلف شعبوں کیلئے اصطلاحات کی علحدہ علحدہ کمیٹی مقرر کی گئی جس میں متعلقہ فن اور لسانیات کے ماہر غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد اصطلاحی الفاظ وضع کرتے تھے۔ مختلف علوم وفنون کی (۱۲) مجلسیں تھیں۔ ہر مجلس میں فن اور زبان دونوں کے ماہر شریک رہتے تھے۔

حسب ذیل اصحاب زبان کے نمائندے تھے۔

پروفیسر وحید الدین سلیم، حیدر یار جنگ طباطبائی، مولوی حمید الدین، مرزا محمد ہادی رسوا،

جوش ملیح آبادی، محمد صفی الدین، عبداللہ العمادی، مرزا مہدی علی خاں کوکب، مولوی عبدالحق۔
ان کے علاوہ جن اصحاب سے بلحاظ ان کے فن کے مشورہ لیا جاتا تھا ان کے نام ہیں۔
خان فضل محمد خاں، عبدالواسع، پروفیسر عبدالرحمٰن، مولوی سید سلیمان ندوی اور سید راس مسعود

مجلس وضع اصطلاحات کا طریقہ کار یہ تھا کہ الفاظ کی فہرست تیار کر کے پہلے ہی ہر ایک رکن کے پاس بھیجدی جاتی تھی اور جب اجلاس منعقد ہوتا تو ایک ایک لفظ اور اس کے اصطلاحی ترجمہ پر بحث ہوتی جب اہل فن اور اہل زبان دونوں کو اطمینان ہو جاتا تو اصطلاح قبول کرلی جاتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی لفظ پر بحث طول ہو جاتی اور کسی نتیجہ پر پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ یہ ایسے الفاظ کی صورت میں ہوتا جسکے مترادفات اردو میں نہیں ہیں۔

اس تعلق سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ انگریزی اصطلاحات کو خصوصاً سائنس مضامین میں قبول کرلیا جائے یا ترجمہ کیا جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ سائنس مضامین کی حد تک ان کے ترجمہ کی ضرورت نہیں ان لفظ کو اردو میں رائج کر دیا جائے لیکن بہی خواہاں اردو اسکو زبان کے مزاج کے خلاف تصور کرتے تھے۔ بالآخر یہ طے لیا گیا کہ اردو میں اصطلاحات وضع کیے جائیں البتہ صرف کیمیا کی حد تک بین الاقوامی اصطلاحات کو ولیسے ہی برتا جائے۔

حمید احمد انصاری مرحوم اس بارے میں توضیح کرتے ہیں:

> "ترجمہ میں پہلا مرحلہ ان اصطلاحات کا پیش آیا جن کے مرادف الفاظ اردو میں نہ تھے۔ کچھ ترغیب ہوئی کہ انگریزی کتابوں میں جو اصطلاحات مستعمل ہیں انھیں بجنسہٖ اختیار کرلیا جائے۔ مگر طولانی بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ علمی اصطلاحات اردو میں وضع کیے جائیں۔ اس میں صرف ایک استثنا کیمیا کے معاملہ میں ہوا۔"

طریقہ عمل میں خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ جسطرح انگریزی کی بعض اصطلاحیں کئی کئی فنون میں استعمال ہوتی ہیں اسی طرح اردو اصطلاحیں بھی اتنی جامع ہوں کہ اور التباس پیدا کیے بغیر ہر جگہ اپنے مخصوص مطالب ادا کرتی رہیں۔ غرض دارالترجمہ نے اصطلاحات کی مجلسوں کے ذریعہ علوم و فنون کی ہزاروں اصطلاح کے ترجمے کیے۔ ان میں طبیعات، ریاضیات، کیمیا، حیوانیات، نباتیات، طب اور انجینیری جیسے علوم اور فلسفہ، منطق، تاریخ، معاشیات، عمرانیات جیسے فنون کا احاطہ بھی ہو گیا۔

اصطلاحات وضع کرنے کے بعد انکی اشاعت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق کی معتمدی کے زمانے میں انجمن ترقی اردو نے اس جانب توجہ کی۔ انجمن کی طرف سے جو تین رسالے اردو، سائنس اور ہماری زبان شائع ہوتے تھے۔ ان رسالوں میں انکی جزوی اشاعت عمل میں آتی تھی انجمن ترقی اردو نے اصطلاحات پر نظر ثانی کا کام بھی انجام دیا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں کیمیا اور طبعیات کی اصطلاحوں کی دو جلدیں شائع کیں۔ افسوس ہیکہ دارالترجمہ کی جانب سے فرہنگ اصطلاحات شائع نہیں کی گئی۔

ان تفصیلات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات کا جو اہتمام جس اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا تھا اس سے بہتر ممکن نہ تھا۔ مزید یہ کہ جن صاحبان علم و زبان سے کام لیا گیا ان کے پایہ کے لوگ نہ اس زمانے میں برصغیر ہند میں موجود تھے اور نہ آج پاکستان میں موجود ہیں۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کیلئے دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کی مجلسوں نے (۳۰) سال کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی، جرمن، عربی اور فارسی سے کیا دارالترجمہ کی ان اصطلاحات کو ہندستان کے اعلیٰ حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ پورے برصغیر میں اور پاکستان میں ان اصطلاحات کا چلن ہے۔ دارالترجمہ کا یہ کارنامہ اتنا عظیم ہے کہ اردو زبان ہمیشہ اس پر فخر کرتی رہیگی جس نے اردو کو ایک ادبی زبان سے علمی زبان بنا دیا۔

تعداد کتب

دارالترجمہ کی کوششوں کا حاصل وہ تراجم و تالیفات ہیں جو دارالطبع جامعہ عثمانیہ میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آگئے ۔ جہاں تک انکی تعداد کا سوال ہے ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد چار سو سے زیادہ ہے ۔

جامعہ عثمانیہ کے ایک فرزند بدر شکیب نے اس سلسلے میں کافی چھان بین کی ہے ۔ ان کی تحقیق و تلاش کا خلاصہ یہ ہے کہ حمید احمد انصاری مسجل جامعہ عثمانیہ کے ایک تحقیقی مضمون سنہ ۱۹۳۰ء کے بموجب دارالترجمہ کی طبع شدہ زیرِ طبع اور زیرِ ترجمہ کتب کی مجموعی تعداد (۲۱۸) تھی ۔ خود جامعہ کے شائع کردہ معلوماتی کتابچہ سنہ ۱۹۴۰ء کے مطابق جملہ مترجمہ شائع شدہ کتابوں کی تعداد (۴۲۵) ہے بہادر یار جنگ اکیڈیمی نے حیدرآباد کی مطبوعات کی ایک قاموس کتب جو سنہ ۱۹۴۵ء میں شائع کی تھی اس میں بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۳۸ء میں بشمول (۱۱۱) مجوزہ کتابوں کے یہ تعداد (۵۳۰) تھی ۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں بشمول مجوزہ کتب یہ تعداد بڑھکر ۶۰۸ ہو جاتی ہے ۔ چونکہ دارالترجمہ سنہ ۱۹۴۸ء تک کام کرتا رہا اور اس درمیان بھی کتابیں شائع ہوتی رہیں اس لئے اگر ان کو شامل کرلیا جائے تو جملہ تعداد (۹۶۰) قرار پاتی ہے ۔

بدر شکیب نے اپنی مطلوبہ فہرست اور کتابچہ مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء کو بنیاد بناکر صرف ان کتابوں کا ہی شمار کیا ہے جن کے اصل مصنف، مترجم کے نام اور سنہ اشاعت کے متعلق کسی قسم کا اشتباہ نہیں تھا ۔ اس لئے انکی مرتبہ فہرست کے مطابق جملہ کتب کی تعداد (۴۲۸) ہے ۔ یہ اعداد بھی قطعی نہیں ہیں کیونکہ خود بدر شکیب کے بیان کے مطابق ان سے زیادہ کا پتہ چلانا آئندہ تحقیق کرنے والوں کا کام ہے ۔ دارالترجمہ کی کتابوں کی اس تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے ۔

جامعہ رہ گئی اُردو کی روایت نہ رہی

مرکزی تسلط کے بعد حیدرآباد کی حکومت میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کے منفی اور مثبت اثرات جامعہ عثمانیہ پر بھی پڑے۔ کچھ پرانی روایات ختم ہوگئیں۔ مذہبی تعلیم کا خاتمہ ہوگیا اور جامعہ کے بنیادی تصور میں یہ تبدیلی ہوئی کہ ذریعہ تعلیم اُردو کے بجائے (جو اس کا امتیازی وصف تھا) جامعہ کے تمام شعبوں میں صرف انگریزی ہی کو لازماً ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا (۱۹۵۰ء)۔

۱۹۴۸ء کے بعد سے جامعہ میں نئے ترقی پسند اقدامات وجود میں آئے۔ جامعہ کے چارٹر کو قانونی صورت دی گئی جس نے یونیورسٹی ایکٹ کی صورت اختیار کی۔ ۱۹۵۴ء میں کل ہند سطح پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا تو ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں کو ایک مربوط شکل دی گئی۔ کئی ایک تدریسی و غیر تدریسی پروگراموں کو روبہ عمل لایا گیا۔

جنرل ایجوکیشن

عثمانیہ یونیورسٹی میں جنرل ایجوکیشن کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے تمام ملحقہ کالجوں میں گریجویشن کی سطح پر رائج کیا گیا۔ اس کورس کا مقصد سائنس اور ہیومانیٹیز میں مربوط ترقی کی راہ ہموار کرنا ہے۔

تین سالہ ڈگری کورس

تعلیم کو تغیر پذیر سوسائٹی کے ترقیاتی مسائل سے ہم آہنگ کرنے کے لئے تین سالہ ڈگری کورس کا آغاز کیا گیا جس کی وجہ سے طلبا ر کو اپنے مضامین کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کا موقع ملا۔

نئے تعلیمی نصاب

سائنس اور آرٹ کے شعبوں میں کئی نئے نصابات نافذ کئے گئے۔

(۱) فلکیات، زراعت، بایو کیمسٹری اور جیو فزکس میں ایم۔ ایس سی کورسس شروع کئے گئے۔

(۲) جرنلزم، لائبریری سائنس اور فزیکل ایجوکیشن کے ساتھ فرنچ، جرمن اور روسی زبان کے ڈپلوما نصاب کا انتظام کیا گیا۔

(۳) گریجویٹ ٹیچرس کی ٹریننگ کے لئے کالج آف ایجوکیشن کا قیام قابل ذکر ہے۔ یہاں بی۔ اے، ایم ایڈ کورسس کے علاوہ ریسرچ کی سہولتیں بھی بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے تحت جملہ (۷) کالج آف ایجوکیشن کام کر رہے ہیں۔

(۴) شعبۂ سائنس میں ایڈوانس اسٹڈی سنٹرس کے تحت اسٹرونومی کا ایڈوانس سنٹر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

(۵) تعلیمی سہولتوں میں اضافہ کے تحت مراسلاتی کورسس بھی شروع کئے گئے ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ طلبار کے لئے متعدد شعبوں میں ایوننگ کورسس کا بندوبست کیا گیا۔

جدید عمارتیں

عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیمی پروگراموں کی توسیع جیسے جیسے ہوتی ہوگئی۔ مزید عمارتوں، لیباریٹریز اور کتب خانہ کی توسیع بھی ضروری ہوگئی، چنانچہ ایڈمنسٹریٹو اور تعلیمی شعبوں کے لئے نئی عمارتوں کی تعمیر عمل میں آئی۔

نئے اقامت خانے

پانچ ہاسٹلوں کے علاوہ یونیورسٹی کیمپس میں گزشتہ تین چار دہائیوں کے درمیان متعدد اقامت خانے تعمیر کئے گئے تاکہ ہر سال مختلف شعبوں میں طلبار کی بڑھتی ہوئی تعداد کے قیام کا بندوبست ہو سکے۔

طالبات کا ہاسٹل　　کیمیکل ٹکنالوجی ہاسٹل　　انجینئرنگ کالج ہاسٹل

لا کالج

لا کالج ہاسٹل کی تعمیر ۱۹۶۰ء میں ہوئی ۔ ہندایانی طرز پر تعمیر کردہ یہ عمارت افادیت اور خوبصورتی کا امتزاج ہے۔

جیو فزکس ڈپارٹمنٹ کی عمارت

یہ کافی وسیع عمارت ہے. اس کی وسعت میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس میں بین الاقوامی سیمینار بھی منعقد ہو سکیں۔

ٹیگور صدی تھیٹر

کیمپس کی موجودہ عمارتوں میں ٹیگور صدی تھیٹر ایک خوشگوار اضافہ ہے ۔ یہ تھیٹر ٹیگور صدی تقاریب کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔ یہ عمارت لینڈ اسکیپ گارڈن کے اس پار لائبریری بلڈنگ کے روبرو تعمیر کی گئی ہے. اس میں بارہ ہزار نشستوں کی گنجائش ہے۔ یہ تھیٹر ڈراموں کی پیشکش اور فلموں کی اسکریننگ کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔

لائبریری بلڈنگ

اس بلڈنگ کا شمار سب سے وسیع تر عمارتوں میں ہوتا ہے جو یونیورسٹی کے سب سے اونچے حصے پر تعمیر کی گئی ہے جو کبھی یونیورسٹی کی عمارتوں کا ماڈل روم تھا۔ پوری عمارت کا فرشی رقبہ ۶۲ ہزار مربع فیٹ ہے۔

طیارہ جیسی ڈیزائن کی اس عمارت کے انٹرنس ہال کو نرمل کی کلاکاری کے دو نمونوں سے سجایا گیا ہے ۔ ان میں ایک اجنتا کا نقش ہے اور دوسرا مہاتما بدھ کو نروان کی حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ درمیان میں بڑے بڑے ہال اور دونوں بازو لانبی لانبی گیلریاں ہیں۔ اس میں ۲½ لاکھ کتابوں کی گنجائش ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس کا افتتاح رادھاکرشنن صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ہوا۔

گیسٹ ہاوز

لائبریری بلڈنگ کے عقبی حصہ میں یہ مہمان خانہ تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ عمارت اپنے محل وقوع اور پرسکون ماحول کی وجہ سے مہمان خانہ کیلئے بہت موزوں ہے، اور تمام عصری سہولتوں سے آراستہ ہے۔

ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ

پہلے جامعہ کے انتظامی شعبے کالج آف آرٹس کی نچلی منزل میں کام کرتے تھے لیکن یونیورسٹی کی تیز رفتار توسیع کے پیش نظر ایک علاحدہ ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ ۱۹۶۷ء میں تعمیر کی گئی۔ وائس چانسلر کا دفتر بھی اسی میں قائم ہے۔

ضمیمہ (۱)

یادداشت

مرتبہ محمد اکبر حیدری معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ

دربارہ قیام حیدرآباد یونیورسٹی

ممالک محروسہ میں تعلیم کے موجودہ سلسلے :- ممالک محروسہ سرکاری عالی میں فی الوقت اشاعت علم کے لیئے تین مختلف سلسلے جاری ہیں ۔

(۱) ۔ وہ سلسلہ تعلیم جو علم دینیہ کے لئے مخصوص ہے ۔ یہ سلسلہ تمام ہندستان میں قدیم سے چلا آتا ہے اور ہمارے مقدس علماء اس مبارک فرض کو قدیم الایام سے انجام دے رہے ہیں اور اہل دنیا ان کے برکات سے مستفیض ہوتے ہیں ۔ ان مدارس کا تعلق ہمارے علما سے ہے اور اس میں سرکار کسی قسم کی مداخلت نہیں کرسکتی البتہ اپنی فیاضی سے ان کی ہمیشہ امداد کرتی ہے اور کرتی رہے گی ۔

(۲) وہ سلسلہ تعلیم جس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے ہے اس سلسلہ کے مدارس کا نصاب تعلیم و امتحانات وغیرہ سب مدراس یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلیمی معاملات میں سرکار کو اس میں کوئی دخل نہیں ۔ اس سلسلہ میں اعلیٰ تعلیم کا مرکز ان ممالک میں صرف ایک نظام کالج ہے ۔ اگرچہ اس کالج میں اعلیٰ قابلیت کے پروفیسر اور مدرس مقرر کئیے گئے ہیں مگر باوجود ان کی مساعی کے اہل ملک اس سے کافی طور پر مستفید نہیں ہوسکے ۔ چنانچہ آٹھ سال (یعنے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء تک) کے عرصہ میں ۲۵۵ طالب علم داخل کالج ہوئے جن میں سے صرف ۱۲ طالبعلموں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۔ باقی تقریبًا ۹۵ فیصدی طلبہ یا تو کامیاب رہے یا کالج چھوڑ کر چلے گئے اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے ۔

(۳) وہ سلسلہ تعلیم جو علوم و السنہ مشرقیہ و دینیات کی تعلیم کے لئے سرکار عالی نے خود

قائم کیا تھا جس سے ہمارے تمدنی ' معاشرتی ' روحانی و مادّی ترقی مقصود تھی ۔ دارالعلوم جس کا قیام اسی غرض سے ہوا ایک مدت دراز سے حیدرآباد میں قائم ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً حسب اقتضائے زمانہ ضروری اور مناسب تغیرات عمل میں آتے رہے ہیں ۔ اگرچہ یہ سلسلہ صحیح اصول پر مبنی ہے کیونکہ سرکار عالی کو اس کے نصاب تعلیم ' امتحانات انتظامی و تعلیمی معاملات میں پورا اقتدار حاصل ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ اس میں اصلاحات کا کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن عملاً اس کا دائرہ افادہ اب تک محدود رہا ہے اور جو اصل غرض و غایت اس کے قیام سے تھی وہ پوری نہیں ہوئی ۔

جدید یونیورسٹی کی ضرورت : لہٰذا ایسی صورت میں یہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی اعلیٰ تعلیم کو ایک خاص نظام کی تحت میں لایا جائے جس کے ذریعہ سے علم کی توسیع و اشاعت کی تدابیر اس طرح عمل میں لائی جائیں کہ اہل ملک عام طور پر اس سے مستفید ہو سکیں یا بعبارت دیگر ہمیں ممالک محروسہ سرکار عالی کے لئے ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کا حیطۂ اقتدار و افادہ بہت وسیع ہو جو اعلیٰ تعلیم کے تمام سلسلوں اور شعبوں پر حاوی ہو اور تمام سرکاری درسگاہوں کو ایک ہی سلسلہ میں مسلسل رکھے تاکہ وہ قوتیں جو اسوقت منتشر ہیں ایک صحیح اصول پر مجتمع ہو کر اس عظیم الشان فرض کو ادا کریں جس پر ملک کی ترقی و بہبودی و فلاح بلکہ حیات کا دارومدار ہے ۔

اس جدید یونیورسٹی میں حسب ذیل دو امور کا خاص طور پر لحاظ رکھنا پڑے گا جو اس کے بنیادی اصول ہوں گے

(۱) تعلیم ملک کی ضروریات و حالات کے مطابق ہو یعنے جس سے ہماری ذہنی اور مادّی ضروریات پوری ہو سکیں اور جس کی بنیاد ہمارے قومی اور ملکی خصائص پر ہو اور محض انڈین یونیورسٹیوں کی نقل نہ ہو ۔

(۲) علم کی عام اشاعت کے ساتھ ساتھ خاص خاص شعبوں میں علمی تحقیقات کا انتظام ہو ۔

ہندستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نقائص : ہندستان کی موجودہ نیز مجوزہ یونیورسٹیوں میں ان میں سے ایک بات بھی نہیں پائی جاتی اور اس لئے وہ ہمارے درد کا درماں اور ہمارے مرض کا علاج نہیں ہو سکتیں ۔

یہ تمام یونیورسٹیاں عموماً امتحان لینے والی ہیں اور ان یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں کی کھپت زیادہ تر سرکاری دفاتر میں ہوتی ہے اور اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے یہی ان کا منشا ہے۔ جو تعلیم ان یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اس میں ہماری ضروریات اور قومی خصائص کا مطلق خیال نہیں ہوتا اور اس لئے وہ ہماری قومی حیات کا جزو نہیں بن سکتی۔ علاوہ اس کے ان یونیورسٹیوں کے پاس کوئی ذرائع ایسے نہیں ہیں کہ وہ علم کی اشاعت عام طور پر کرسکیں۔ ان کی تعلیم ایک خاص جماعت تک محدود رہتی ہے اور یہ جماعت اپنے معلومات اور خیالات اپنی زبان میں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے یہ تعلیم ناقص محدود اور اکثر بیکار ہوتی ہے۔ اور اس بڑے نقص کی اصل وجہ یہ ہے تعلیم ایک غیر زبان کے ذریعہ سے دی جاتی ہے جس کے نتائج نہایت مضرت رساں اور تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ یہ اس غلط پالیسی کا نتیجہ ہے جو ابتدا میں حالات کی تہ تک نہ پہنچنے اور واقعات پر صحیح نظر نہ ڈالنے کی وجہ سے اختیار کی گئی اور ہماری یونیورسٹیاں اور درسگاہیں اب تک اس پر کاربند ہیں۔

موجودہ طریقہ تعلیم کی تاریخ: ۱۸۳۵ء میں بعہد لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل ہند ایک کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لئے بیٹھی کہ اہل ہند کو تعلیم دینے کا کیا ڈھنگ اختیار کیا جائے۔ اس کمیٹی میں اسوقت کے اچھے اچھے قابل اور مدبر لوگ شریک تھے اس مسئلہ پر ان کا اختلاف رائے ہوا۔ ایک فریق یہ کہتا تھا کہ ان کی تعلیم اسی قدیم طرز پر ہونی چاہیئے جو اس وقت تک رائج ہے اور ان کے مدارس میں عربی فارسی اور سنسکرت اور قدیم علوم کی تعلیم جاری رکھی جائے اور یہی صورت ان کی حالت کے مناسب بھی ہے۔ دوسرا فریق جس کا سرگروہ انگلستان کا مشہور مورخ اور فصیح البیان ادیب (لارڈ) میکالے تھا یہ کہتا تھا کہ قدیم السنہ و علوم کی تعلیم محض بیکار اور تضیع اوقات ہے اور اہل ہند کو علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی تعلیم سے محروم رکھنا سخت ناانصافی ہوگی۔ اگرچہ یہ آخری فریق قلیل تھا لیکن (لارڈ) میکالے کی فصاحت بلاغت اور آتش بیانی غالب آئی اور ہندستان کی تعلیم کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے ہوگیا اور اس وقت سے آج تک ہندستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسی پر عمل ہورہا ہے یہ ایک بہت دلچسپ بحث تھی اور ہر فریق اپنی اپنی رائے میں ایک حد تک صحیح تھا بحث طلب اور قابل فیصلہ یہ امر نہیں تھا کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے یا نہ

دی جائے بلکہ اصل چیز اور بنیادی اصول کے ذریعہ تعلیم کس زبان کو قرار دیا جائے - مباحثہ و مناظرہ کی گرمی اور لارڈ میکالے کی فصاحت و جادو بیانی کی رو میں یہ نظر انداز ہوگیا اور اس ذرا سی چوک سے وہ نقصان عظیم نقصان پہنچا ہے کہ اس کی تلافی تو درکنار رخ کا بدلنا بھی دشوار ہوگیا ہے۔

غیر زبان کو ذریعہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اب تک صحیح ذوق علم پیدا نہ ہوا اور نہ عام طور پر علم کی اشاعت ہو سکی۔ کیا یہ افسوسناک حالت نہیں ہے کہ تقریباً ایک صدی کی تعلیم کے بعد بھی ہمارے ملک میں اعلیٰ درجہ کے منصف تو کیا اعلیٰ درجہ کے مترجم بھی پیدا نہیں ہوئے۔ علاوہ اس کے جو دماغی، جسمانی، اخلاقی و معاشرتی نقصان پہنچے ہیں وہ الگ ہیں۔

غیر زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کے نقصانات: چونکہ یہ مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور تعلیم کے بنیادی اصول کا روح و رواں ہے لہٰذا اُن نقصانات پر جو غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے عائد ہوتے ہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی ہے

(۱) غیر زبان کے ذریعہ سے حصول تعلیم میں دماغ پر بیجا اور غیر معمولی بار پڑتا ہے اور اس محنت اور وقت کے مقابلہ میں جو اس پر صرف کیا جاتا ہے فائدہ بہت قلیل ہوتا ہے۔

(۲) طلبہ غیر زبان کی مشکلات اور اس کی اصطلاحات و محاورات کو سلجھانے میں اسقدر الجھے رہتے ہیں کہ اصل مضمون فروگزاشت ہوجاتا ہے اور تعلیم کا مدار حافظہ پر رہ جاتا ہے

(۳)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حافظہ کی مدد سے امتحان کی کامیابی اصل مقصد قرار پا جاتا ہے اور علم ایک ضمنی شئے رہ جاتی ہے اور اس لئے وہ کبھی جزو زندگی نہیں ہوتا۔

(۴)۔ طبیعت کی جودت و جدت کند بلکہ اکثر اوقات مفقود ہوجاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ھمارا مایۂ علم و فضل تقلیدانہ ترجمانی یا نقالی ہوتا ہے۔

(۵)۔ فارغ التحصیل طلبہ صرف دفاتر سرکاری کے کام کے ہوتے ہیں علمی ذوق پیدا نہیں ہونے پاتا اور نہ علمی مشاغل اور دیگر مفید پیشوں اور کاموں کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے

(۶)۔ موجودہ طریقہ تعلیم سے جو غیر زبان کے ذریعہ دی جاتی ہے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ جماعت میں بہ لحاظ اختلاف خیالات ایک دریا حائل ہوگیا ہے اور بظاہر دیکھنے سے یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ ایک ملک کے باشندے اور ایک قوم کے افراد ہیں جدید خیالات اس طریقہ تعلیم کی وجہ سے عام لوگوں تک پہنچنے نہیں پاتے کیونکہ وہ ایک اجنبی اور غیر مانوس زبان میں

مدفون ہیں ۔ ایک ہی ملک میں یہ تفریق نہایت دل شکن ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب جوان خیالات کے حامل ہیں اپنی زبان میں ان کی ترجمانی سے قاصر اور معذور ہیں ۔

یہاں تک کہ ایک ہی خاندان کے ارکان میں بھی یہ افسوسناک تفریق پائی جاتی ہے خصوصًا عورتیں جو عمومًا انگریزی کی اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کرسکتیں اور اپنی زبان میں ان کے لئے کوئی سرمایہ نہیں ۔ اس کی بین مثال ہیں ۔ اس طرح یکجہتی اور ہمخیالی مفقود ہوجاتی ہے اور ہمارے خاندانوں میں وہ مسرت اور خوشدلی نہیں پائی جاتی جو مایۂ زندگانی ہے ۔ یہ ایک حیرت انگیز اور دل شکن منظر ہے کہ ایک ہی خاندان میں اعلیٰ تعلیم اور ابتدائی انسانی جہالت دوش بدوش پائی جاتی ہیں ۔

(۷) جس کا ماحصل یہ ہیکہ ایک طرف ہماری یونیورسٹیاں اور درسگاہیں اپنے غلط طریقہ کی وجہ سے اور دوسرے طرف ہمارے تعلیم یافتہ جو اس طریقہ کے معمول ہیں ملک میں عام طور پر علم کی روشنی پھیلانے میں قاصر و ناکامیاب ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ملک میں عام طور پر علم اس وقت تک رائج نہیں ہوسکتا جب تک کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی زبان نہ ہو ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک قلیل فرقہ میں محدود رہا جو بدقسمتی سے نہ خود بہرہ ور ہوسکا اور نہ دوسروں کو مستفیض کرسکتا ہے ۔

(۸) ایک سترہ اٹھارہ برس کا یورپین لڑکا اپنے ہم عمر ہندستانی لڑکے سے کہیں زیادہ علم رکھتا ہے ۔ اس لئے نہیں کہ وہ زیادہ ذہین ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے تعلیم اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے حاصل کی ہے ۔ اس نے جو کچھ سیکھا ہے وہ اس کے دماغ و فکر کا جزو ہوجاتا ہے ۔ یہاں ہندستانی لڑکا اس عمر تک الفاظ کے گورکھ دھندے سے بھی باہر نہیں نکلتا چونکہ یورپین لڑکا علم اپنی زبان کے ذریعہ سے سیکھتا ہے لہذا اس کا وقت کم صرف ہوتا ہے اور وہ باقی وقت جسمانی ورزش یا مطالعہ میں صرف کرسکتا ہے اور اگر وقت کم صرف بھی نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ اس کے دماغ پر بیجا بار نہیں پڑتا اور سب کچھ آسانی سے سیکھ لیتا ہے اس لئے اس کی جسمانی اور دماغی حالت خود بخود بہتر ہوجاتی ہے ۔

اپنی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا ایک فطرتی اصول ہے اس کے برعکس غیر زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا ان کی فطرت کے خلاف ہے ۔ ایک یورپین لڑکا اس اصول تعلیم کی بدولت بلا خاص تردد و سعی کے علم اسطرح سیکھتا چلا جاتا ہے جس طرح کوئی پانی پیتا یا ہوا سونگھتا ہے

اس صحیح طریقہ تعلیم کی وجہ سے اس میں خود بخود اعتمادی اور خودداری کے جوہر پیدا ہو جاتے ہیں جن میں انسانی کامیابی کا راز مضمر ہے ۔

(۵) سالہا سال کی محنت اور دماغ سوزی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہم غیر زبان کے الفاظ کے ناقص علم کے لئے اشیاء کے صحیح علم کو قربان کر دیتے ہیں

قدیم طریقہ تعلیم پر یہ اعتراض ہے اور وہ بہت کچھ صحیح بھی ہے کہ اس میں الفاظ کے لئے واقعات کو اور زبان کی خاطر اصلیت کو قربان کر دیا جاتا ہے ۔ ہم ایک زمانہ سے اس میں مبتلا رہے ہیں ۔ لیکن موجودہ طریقہ تعلیم نے اس میں کیا اصلاح کی ؟ مطلق نہیں ۔ بلکہ برخلاف اس کے اس نے انگریزی زبان کی تحصیلِ علم قرار دے کر ہمارے اس عیب کو اور جلا دے دی ہے اور ہم ابھی تک الفاظ کے ہیر پھیر سے باہر نہیں نکلتے ہیں بلکہ اس دلدل میں اور دھنستے چلے جاتے ہیں ۔

غرض موجودہ طریقہ تعلیم کی روانگی اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک اور تباہ کن نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقہ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن و معاشرت، قوائے دماغی و جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے چلے جا رہے ہیں ۔ ہمیں **ایک جدید یونیورسٹی** کی ضرورت ہے ۔ جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم، ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو ۔ جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف و تراجم کا کام بھی کرے اور جو تربیت ذہن اور تحصیل علوم دونوں کے لئے اپنی ہی زبان یعنے اردو کو کام میں لائے ۔

اصل حقیقت یہ ہیکہ تعلیم مثل مشین کے نہیں ہے کہ جہاں چاہا اٹھا لے گئے اور کام میں لانے لگے ۔ بلکہ اس کا تعلق ملک کے حالات اور خصوصیات سے اسقدر وابستہ ہے کہ ایک ملک کا طرز و انتظام تعلیم دوسرے ملک کے لئے اس وقت تک مفید اور موثر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں کافی ترمیم و اصلاح اپنی ضروریات و حالات کے لحاظ سے نہ کر لی جائے اور جب تک کسی نظام تعلیم میں قومی اور ملکی عنصر نہ ہوگا اور خاصکر جب تک تعلیم ملکی زبان میں نہ ہوگی وہ کبھی ملک کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں سراسر مضرت ہے ۔

ہز ایکسلینسی وائسرائے بہادر کی رائے: چنانچہ خود ہز ایکسلینسی وائسرائے بہادر نے اپنی اس تقریر میں جو مجلس ناظمان تعلیمات کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اس بارے میں نہایت معقول طور سے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

ہز ایکسلینسی نے ارشاد فرمایا۔

"حالت موجودہ میں ہماری اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تحصیل انگریزی زبان ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان ملازمت کا ذریعہ ہے۔ اور دیسی زبانوں میں نصاب تعلیم کی کتابیں دستیاب نہیں ہوسکتیں، لیکن اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ طالب علم ایک غیر زبان کے ذریعہ سے دقیق مضامین کو تحصیل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور چونکہ اکثر حالتوں میں ان کی واقفیت اس زبان سے واجبی سی ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں مجبوراً کتب نصاب حافظہ کے زور سے ازبر کرنی پڑتی ہیں۔ ہم اس رٹنے کی عادت پر سخت نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں طالبعلموں کی یہ سرگرمی اور جوش قابل تحسین ہے جو بجائے اس کے کہ حصول علم کی سعی ترک کردیں صفحے کے صفحے' نہیں بلکہ کتابیں کی کتابیں رٹ ڈالتے ہیں۔ جنھیں وہ بہت کم سمجھتے ہیں۔ یہ بلاشبہ طریقۂ تعلیم کی بے اصولی ہے۔ چند روز ہوئے مجھے ایک ہندستانی جنٹلمین سے اس مضمون پر گفتگو کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے اس بارے میں اپنے ذاتی تجربات کو بیان کیا۔ ان کا بیان ہے کہ ان کا ایک مضمون تاریخ بھی تھا اگرچہ وہ اب انگریزی کے عمدہ ادیب ہیں۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ اس زمانہ میں ان کا علم انگریزی زبان کا اسقدر کم تھا کہ وہ نصاب کی کتاب پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے تمام کتاب ازبریاد کرڈالی۔ امتحان کے پرچہ سوالات میں ایک سوال ایسا تھا جس کا جواب انہیں معلوم تھا کہ

کتاب کے فلاں صفحہ پر ہے۔ لیکن اس امر کا یقین نہ تھا کہ صفحہ کا کونسا حصہ اس کا صحیح جواب ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے بربنائے احتیاط سارا صفحہ نقل کر ڈالا۔ اور اس کے لئے جسقدر نمبروں کی انہیں توقع تھی اس سے بہت کم ملے۔ ممتحن سے رد وکد کرنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ان کے جواب میں بہت سی غیر متعلق باتیں تھیں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے سوال کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔

میری رائے میں یہ شہادت ہمارے نظام تعلیم کے نقائص کو پوری طور پر ظاہر کرتی ہے۔ میں آپ صاحبوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور اپنے سے بھی بحیثیت ایک یونیورسٹی مین کے دریافت کرتا ہوں کہ اگر ہماری تمام وکمال تعلیم کسی اجنبی زبان کے ذریعہ سے ہوتی تو ہماری تعلیم کا کیا حشر ہوتا۔ کچھ تعجب نہیں کہ ہم مایوس ہو کر تحصیل علم کی کوشش کو ترک کر دیتے مگر میں ان طالبعلموں کی ہمت کی بے انتہا تعریف کرتا ہوں جو مردانہ وار ان تمام مشکلات پر غالب آتے ہیں جو ایک مذموم طریقۂ تعلیم نے ان کے راستہ میں حائل کی ہیں۔

کونٹ ادکوما کی رائے کونٹ ادکوما نے جو جاپان میں نہایت نامور اور فاضل اور بے نظیر شخص گزرا ہے۔ ایک خاص نظام تعلیم قائم کیا اور جدید یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی اس کی رائے ہے کہ

"میرا کامل یقین ہے کہ قوم کی اعلیٰ ترقی اپنی زبان کے صحیح اور کامل استعمال میں ہے تاکہ ہم اعلیٰ تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ سے حاصل کرسکیں۔"

جاپان کے تمام علماء و مدبرین نے اسکی تائید کی اور اس نے اپنی بنا کردہ یونیورسٹی میں اسی طریقہ کو جاری کیا اور اب وہاں کی تمام یونیورسیٹوں میں اسی پر عمل ہوتا ہے۔

تمام عالم میں صرف ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں تعلیم غیر زبان کے ذریعہ دی جاتی

ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم میں سب سے پیچھے ہے۔ لہذا اس نظام کا بدلنا ناگزیر ہے اور سب سے پہلے اس مبارک اور عظیم الشان کام کی ابتدا اعلحضرت واقدس کے زیر عاطفت حیدرآباد میں ہوگی۔

مجوزہ حیدرآباد یونیورسٹی کے متعلق چند شبہات

ممکن ہے کہ حیدرآباد میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کے خلاف بعض شبہات پیدا ہوں جن کے رفع کرنے کے لئے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے

(۱) اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کیوں قرار دیا جائے جبکہ ریاست میں دوسری زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔

(۲) اردو زبان میں جو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے علوم جدیدہ کا سرمایہ کافی نہیں ہے

(۳) مجوزہ نظام تعلیم میں انگریزی زبان کی تعلیم ناقص اور کمزور رہ جائیگی اور یہ نقص جدید علوم و خیالات کی تحصیل میں مزاحم ہوگا۔

(۴) ریاست میں کافی تعداد ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کی نہیں ہے جو اس قسم کی یونیورسٹی کو چلا سکیں۔

مجوزہ یونیورسٹی کے منصوبے کے وقت یہ تمام شبہات پیش نظر تھے اور ان پر ہر پہلو سے کامل طور پر غور کرلیا گیا ہے۔ یہ شبہات اس وجہ سے بھی کھٹکتے ہیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں اس حیثیت و نوعیت کی کوئی یونیورسٹی موجود نہیں ہے ورنہ یہ اعتراضات کچھ ایسے قوی اور وزنی نہیں جو ہمارے ارادے اور مجوزہ نظام تعلیم کے مانع ہوں۔

شبہات بالا کے جوابات

یہ امر بوضاحت بیان ہو چکا ہے کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ہمارے اغراض کے لئے کسی طرح مفید نہیں لامحالہ سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس ریاست کی ملکی و مروجہ زبانوں میں سے کسے ترجیح دی جائے۔ بہترین تدبیر جس میں کسی کو عذر یا اعتراض نہیں ہوسکتا یہ ہوگی کہ تمام مروجہ زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے جس کے یہ معنے ہوں گے کہ کم سے کم چار یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ لیکن مالی لحاظ سے یہ تدبیر قطعی ناقابل عمل اور غیر ممکن ہے اس لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ کسی ایک ملکی زبان کو انتخاب کیا جائے جو تمام ملک ہندستان کی مشترکہ زبان خیال کی جاتی ہو۔ اور وہ سوائے اردو کے کوئی دوسری زبان نہیں۔ علاوہ اس کے۔

(۱) اردو اس ریاست کی دفتری اور درباری زبان ہے اور اسکی حیثیت یہاں وہی ہے جو برٹش انڈیا میں انگریزی زبان کی ہے ۔

(۲) یہ بھی ایک آریائی زبان ہے اور تمام ہندستان کی مشترکہ زبان خیال کی جاتی ہے اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے پیدا ہوئی ہے اور اسے سنسکرت اور ہندی سے اسی قدر تعلق ہے جس قدر عربی و فارسی سے

(۳) اس ریاست میں عام طور پر سب لوگ اردو سمجھتے یا بولتے ہیں اور اس کی تحصیل میں ان طلبہ کو بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ، زیادہ دقت پیش نہیں آئیگی ۔

یہ اعتراض کہ اردو زبان میں ابھی علوم جدیدہ کا کافی سرمایہ نہیں گو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن وہ قیام یونیورسٹی کا مانع نہیں ۔ اردو زبان میں کافی صلاحیت موجود ہے کہ اگر تالیف و تراجم کا شعبہ مجوزہ یونیورسٹی کے ماتحت دائمی طور پر قائم کردیا گیا تو قلیل عرصہ میں اردو زبان میں ایسی کتابیں تیار ہوسکتی ہیں جو کالج کی تعلیم کے لئے کام آسکتی ہیں اب تک جو یہ کام نہیں ہوا اور اردو زبان ان علوم سے خالی رہی تو یہ زبان کا قصور نہیں بلکہ اسکی وجہ یہ ہیکہ ابھی تک اسکی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی ۔ اور مروجہ طریقہ تعلیم کی وجہ سے ملک میں اس کی مانگ نہ تھی۔ اس امر کا کامل اطمینان کرلیا گیا ہے کہ یونیورسٹی قائم ہونے پر تمام ضروری علوم پر اردو میں کتابیں مرتب ہوجائینگی ۔ اور اس کا سامان فراہم کیا جارہا ہے ۔ کالج کے ابتدائی درجوں کی تعلیم کے لئے اس وقت بھی کتابیں اردو میں موجود ہیں ۔ قیام یونیورسٹی کے بعد شعبۂ تالیف و تراجم چند سال کے عرصہ میں ضروری کتب تیار کردیگا ۔ اور اس سے قبل ان کی ضرورت بھی واقع نہ ہوگی کیونکہ ابتدائی درجوں کے طلبہ کو اعلیٰ درجوں میں جانے کے لئے کم سے کم تین چار سال لگیں گے ۔ دوسرے پروفیسر ول کے لکچر اردو میں ہوں گے مگر چونکہ انگریزی زبان کی تحصیل لازمی ہوگی اس لئے طلبہ انگریزی کتب سے بلا تکلف استفادہ کرسکیں گے ۔

چالیس پچاس برس قبل جاپانی زبان بھی علوم جدیدہ اور سائنس میں اردو کی طرح کم مایہ تھی۔ لیکن اب وہی زبان ہے کہ تمام علوم اس میں موجود ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ملکی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس میں کامیابی نہ ہو ۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ انگریزی زبان کی تعلیم ناقص اور کمزور رہ جائیگی ۔ کیونکہ اوّل تو

انگریزی کا سیکھنا طلبہ کے لئے لازمی ہوگا ۔ دوسرے جب انگریزی بحیثیت ایک زبان کے پڑھائے جائیگی تو یقین ہے کہ طلبہ میں اس کی علمی استعداد زیادہ ہوگی ۔ زبان کی تحصیل زیادہ تر طریقۂ تعلیم پر منحصر ہے اور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ مجوزہ یونیورسٹی میں زبان انگریزی جدید ترین طریقہ پر سکھائی جائے ۔ انگریزی کو بہ حیثیت زبان کے سکھانے سے ہمارا منشاء یہ ہے کہ ہم مروجہ جدید زبان انگریزی کی تعلیم اس طرح سے دیں کہ ہمارے طلبہ اپنے کام میں، اپنے مافی الضمیر کے ادا کرنے میں تحریر میں اسے بخوبی استعمال کرسکیں۔ اور جن علوم کا انہیں شوق ہے ان میں اپنے معلومات کا اضافہ کرنے کے لئے آسانی سے انگریزی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں ۔ ہم لسانی نکتوں، علم نحو و معانی و بیان و بلاغت کی باریکیوں، تاریخ لسان اور پرانی زبان اور قدیم شعراء کے مطالعہ میں جن کا اسوقت کوئی ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا ان کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہر شخص انگریزی کا اعلیٰ ادیب نہیں ہوسکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے ۔ لیکن جن میں یہ صلاحیت ہے اور وہ انگریزی زبان کا ادیب بننا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی اس تجویز میں گنجائش رکھی جائیگی یعنے علاوہ انگریزی کی لازمی تعلیم کے، اختیاری مضامین میں بھی ایک مضمون ایک مضمون انگریزی زبان کا رکھا جائے گا ایسے طلبہ اس مضمون کو لے سکتے ہیں اور شوق سے دقت نظر کے ساتھ اس کا مطالعہ کرسکتے ہیں ۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ انگریزی شعبہ کو کمزور کیا جائے ۔ کیونکہ جدید خیالات سے آگاہ رہنے اور اپنی زبان کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے اس کی تعلیم نہایت ضروری ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ نظام کالج کے گرایجویٹوں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن اگر مدراس یونیورسٹی کے گرایجویٹوں کی تعداد کم ہے تو انگلستان اور ہندستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نیز ایسے علماء کی تعداد جنھوں نے اگرچہ زبان انگریزی کی تحصیل امتحانات یونیورسٹی کے لئے نہیں کی مگر وہ صاحب علم و فضل اور جدید و قدیم طرز تعلیم سے واقف ہیں کچھ کم نہیں ۔ یہ سب مل کر ایک ایسی تعداد ہے جو ہمارے اغراض کے لئے کافی ہے اور اگر بالفرض ایسے لوگوں کی کمی بھی ہو تو یہ کمی اس پر دال ہے کہ اب تک ہماری اپنی کوئی یونیورسٹی نہ تھی اور ہم ایسی یونیورسٹیوں کے دست نگر تھے جو ہماری تعلیمی اغراض کو پورا نہیں کرسکتی تھیں اور اسی لئے اس ریاست میں قیام یونیورسٹی کی ضرورت اور بھی اہم اور ناگزیر معلوم ہوتی ہے ۔

اس ضمن میں ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں موجودہ تعداد طلبہ اس قدر کافی نہیں ہے

کہ ایک جدید یونیورسٹی کا قیام مناسب خیال کیا جائے۔ لیکن یہ احتمال بھی زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ اگر ابتدا میں طلبا کی تعداد زیادہ نہ ہوگی تو کچھ زیادہ فکر و اندیشہ کی بات نہیں۔ دیگر ممالک میں بھی بعض جدید یونیورسٹیاں ابتدا میں صرف قلیل تعداد طلبہ سے قائم کی گئی ہیں۔ مثلاً جاپان کی واسیڈا یونیورسٹی میں پہلے سال صرف (۶۴) طالب علم تھے۔ اسی طرح کنیڈا کی ساس کٹ چیون یونیورسٹی میں جو ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئی تعداد طلبہ صرف (۷۰) تھی اور اس وقت کم و بیش (۱۵۰) ہے۔ اسی ملک کے کال گیری یونیورسٹی میں ۱۹۱۴ء میں طلبہ کی تعداد (۵۷) تھی۔ ارکیڈیا یونیورسٹی میں دو سال قبل تعداد طلبہ (۲۱۶) تھی۔ جاپان کی کیوشو یونیورسٹی میں (۲۵۹) سے زیادہ طلبہ نہ تھے۔ غرض جسقدر شبہات قیام یونیورسٹی کے خلاف وارد کئے گئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں جو اس منصوبہ کے مانع و مزاحم ہوں۔

ہندستان کی موجودہ اور مجوزہ یونیورسٹیاں ہمارے درد کا علاج نہیں

اس چند سال کے عرصہ میں برٹش گورنمنٹ نے مختلف صوبوں اور ہندو مسلمانوں کی جداگانہ یونیورسٹیوں کے قیام اور منظوری پر خاص توجہ کی ہے۔ ہندو یونیورسٹی بنارس میں قائم ہو چکی ہے مسلم یونیورسٹی کا معاملہ قریب قریب طے پا چکا ہے اور یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے بھی چارٹر مل جائیگا۔ پٹنہ یونیورسٹی کا بل شاہی کونسل میں پیش ہو چکا ہے۔ ڈھاکہ۔ ناگپور اور رنگون کا مسئلہ زیر تجویز ہے۔

ہماری پڑوسی ریاست میسور کی یونیورسٹی بھی حال ہی میں قائم ہوئی ہے۔ ریاست میسور نے کئی سال قبل اس کی تیاری کی تھی۔ اور مہاراجہ کالج کے ایک قابل پروفیسر مسٹر ریڈی کو خاص طور پر یورپ، جاپان، کنیڈا، آسٹریلیا بھیجا گیا تھا تاکہ وہاں کی یونیورسٹیوں کے حالات بذات خود معائنہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے تمام یونیورسٹیوں کو جاکر خود دیکھا اور ان کے حالات اور نظام تعلیم کا بغور مطالعہ کیا اور ایک مفصل رپورٹ پیش کی اور نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ یہ رائے دی کہ میسور میں جو یونیورسٹی قائم ہو اس میں ذریعۂ تعلیم ملکی زبان قرار دی جائے۔ مگر چونکہ ریاست میسور ایک زمانہ تک انگریزی عمل میں رہی تھی اور اس کی دفتری اور سرکاری زبان انگریزی تھی جو اب تک قائم رہی اس لئے یونیورسٹی کمیٹی کو مجبوراً اس رائے کے تسلیم کرنے میں تامل ہوا۔

یہی حال برٹش انڈیا کی یونیورسٹیوں کا ہے اگرچہ ماہرین تعلیم کی حقیقی رائے یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم ہمیشہ ملکی زبان ہونی چاہیے چنانچہ اس کی تصدیق ہز ایکسلنسی ویسرائے بہادر کے اس خیال سے ہوتی ہے جسکی نقل اوپر کی گئی ہے لیکن چونکہ تقریبًا ایک صدی سے ملک میں انگریزی زبان کا عمل ہے اور دفاتر نیز دوسرے کاروبار میں انگریزی رائج ہے اس لئے یکلخت اس کا اٹھادینا ممکن نہیں اور اس مجبوری کی وجہ سے وہ صحیح نظام تعلیم کے رواج دینے سے قاصر ہیں۔

اس عرصہ میں جو جدید یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں یا قائم ہونے والی ہیں ان کا نظام قدیم یونیورسٹیوں سے کسی قدر مختلف ضرور ہے لیکن وہ چیز جو ہم چاہتے ہیں اور جو قیام یونیورسٹی کی اصل غایت ہے وہ ان میں بھی مفقود ہے اور باوجود اہل ملک کی تمنا اور ہز ایکسلنسی ویسرائے بہادر کی خواہش کے ان تمام مقامات میں زمانہ دراز کی خاص روش اور رواج کی وجہ سے اس قسم کی مجبوریاں اور دشواریاں ہیں کہ وہ ملک اور گورنمنٹ کے نصب العین کو عمل میں لانے سے قاصر ہیں ۔ لیکن ہمیں ابھی یہ موقع حاصل ہے اور اگر اس وقت یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر ایک مدّت کے بعد وہی مجبوریاں اور دشواریاں ہمارے راستہ میں بھی حائل ہوں گی اور جتنی تاخیر ہوگی اسی قدر منزل مقصود دور ہوتی جائیگی ۔

عالیجناب نواب فخر الملک بہادر معین المہام تعلیمات کی رائے

عالیجناب نواب فخر الملک بہادر معین المہام تعلیمات نے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا اور متعدد بار حیدرآباد میں قیام یونیورسٹی کی تحریک فرمائی لیکن چونکہ وہ زمانہ اس عظیم الشان کام کے موافق نہ تھا اس لئے وہ مناسب صورت میں پیش نہ ہوسکی ۔

حیدرآباد میں اس قسم کی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے متعلق بعض محترم علماء اعلیٰ ذمہ دار عہدہ داروں اور ماہران تعلیم کی رائیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں ۔

نواب عماد الملک بہادر کی رائے

نواب عماد الملک جو جامع علوم مشرقیہ و مغربیہ ہیں عرصہ دراز تک ممالک محروسہ سرکاری عالی کے ناظم تعلیمات رہے۔ بزمانہ لارڈ کرزن ایجوکیشن کمیشن کے ممبر مقرر کئے گئے ان کی رائے اس معاملہ میں نہایت مستند اور خاص اعتماد کے قابل ہے جو حسب ذیل ہے :

" اونیٰ تامل اس رائے کی صحت کو واضح کردیتا ہے کہ فروغ علمیہ

کا حاصل کرنا اور ہر علم کے مسائل کو سمجھنا اور اون کو ذہن میں مستحضر
رکھنا آسان نہیں ہے مگر اس غایت کا حصول بدرجہا مشکل تر ہو جاتا
ہے جبکہ ذریعہ تعلیم کوئی اجنبی زبان قرار دی جائے جس پر مبتدی کو
قدرت وحکومت حاصل نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے
کہ تاریخ (جغرافیہ) حساب، اقلیدس وغیرہ مدارس میں سکھائے جاتے
ہیں اس تعلیم میں علوم مذکورہ کے مسائل مقصود بالذات ہوا کرتے ہیں
اور اون کا سمجھنا اور اون کو یاد رکھنا طالب علم کے لئے لازم و
ضرور ہوتا ہے ۔ پھر اگر ان علمی شاخوں کو کسی غیر زبان کی وساطت
سے تعلیم دیا جائے جو طالب علم کی مادری زبان نہیں ہے تو اوس بیچارہ
کو دونی بلکہ چوگنی دقت کا سامنا پڑجائیگا ۔ اول تو ایک اجنبی زبان
کے کلمات اور محاورات اور جملوں کی ترکیب اور اون کے مفہوم کو سمجھنا
اور یاد رکھنا اور گویا محض اوس کے ضمن میں علمی مسائل کو اس طور پر
ذہن نشین کرنا کہ عملی طور پر اون سے کام لیا جاسکے ۔ ایں خیال است
ومحال است وجنوں ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ طریقہ کے انگریزی
مدارس میں طلبہ دس بارہ سال سے کم مدت میں میٹریکیولیشن کے درجہ
تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور لطف یہ ہے کہ اس مدت مدیہ
کی محنت اور جانفشانی اور عرق ریزی پر بھی طریقۂ مذکور سے انگریزی
زبان درست طور پر حاصل نہیں ہوتی ۔ چنانچہ طلبہ کو کالجوں میں داخل
ہوکر لکچروں کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے اور نہ وہ انگریزی عبارت لکھنے پر
قادر ہوتے ہیں ۔ عقل اور تجربہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی غیر زبان
خواہ عربی ہو خواہ انگریزی جس کا حاصل کرنا مطلوب ہے بحیثیت
ایک اجنبی لغتہ کے مقصود بالذات قرار دے کر سکھائی جائے اور علوم
متعارفہ جس کا ذکر گزر چکا ہے بطور علوم کے اپنی زبان میں سکھائے
جائیں ۔ اس طریقہ سے دونوں اغراض بجائے خود علحدہ علحدہ کامل

طور پر حاصل ہوا کریں گے اور ... ت طلبہ کا اسقدر ضائع نہ ہوگا جس قدر موجودہ سرلیہ میں ضائع ہوتا ہے۔

میں یقینی طور پر دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اگر یہ طریقہ تعلیم جاری ہوگیا تو یہاں کے اعلیٰ امتحان وادد طلبہ انگریزی بی۔اے اور ایم۔اے سے لیاقت وقابلیت میں سبقت لے جائیں گے

پروفیسر مارگولیتھ کی رائے ! پروفیسر مارگولیتھ پروفیسر عربی آکسفورڈ یونیورسٹی، ممبر برٹش اکاڈیمی عربی زبان کے مسلم ماہر اور علاوہ تاریخ اسلام وادب عربیہ کے علم وفضل و عام معلومات علمیہ میں وسیع النظر بلکہ ایک مشہور مصنف ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے معتمد تعلیمات کو حسب ذیل تحریر کیا ہے۔

" مجھے معلوم ہوا کہ دارالعلوم میں جدید دینوی علوم کی تدریس میں بہترین طریقہ تعلیم پر کامل اور خالص توجہ کی جاتی ہے۔ صدر صاحب دارالعلوم نے نہایت اخلاق سے مجھ سے اس بارہ میں میری رائے دریافت فرمائی مجھے ان سے اتفاق ہے کہ ان علوم کے لئے بہترین ذریعہ تعلیم طالبعلموں کی اپنی زبان ہے مجھے یہ صاف اور بین معلوم ہوتا ہے کہ جب مدرس کا منشا وطالب علم کے شوق کو مشتعل کرنا اور اس کی قوت خیال کو ترقی دینا ہے تو اگر وہ تعلیم کے لئے اسی زبان کو استعمال کرے گا جس میں طالب علم فطرۃً سوچنے کا عادی ہے تو اسے یقیناً کامیابی ہوگی۔ ہندستان میں آنے سے قبل مجھے اردو زبان کی وسعت وترقی کا کافی اندازہ نہ تھا، لیکن اب میری یہ رائے ہے کہ اس غرض کے لئے اردو زبان کا استعمال اہل ہند کے لئے مختلف حیثیتوں سے مفید ثابت ہوگا۔"

رائٹ آنریبل مسٹر فشر کی رائے | رائٹ آنریبل مسٹر فشر، جو اس سے قبل آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر تاریخ اور لیڈز یونیورسٹی کے چانسلر تھے اور بوجہ

اعلیٰ علمی قابلیت اور تعلیمی تجربہ و ماہر فن ہونے کے موجودہ کیبنٹ برٹش ایمپائر کے ممبر بحیثیت وزیر تعلیمات ہوئے اور پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہونے کی وجہ سے وہ ہندستان کے مختلف مقامات میں دو دورے کر چکے ہیں اور اس اثناء میں ان کو ہندستان کے عام تمدن اور تعلیمی حالات پر غائر نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے ۔ انہوں نے اپنے ایک خانگی خط میں مسٹر راس مسعود سے اس تجویز کے بارے میں مفصلۂ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے ۔

"آپ کی تجویز حیدرآباد میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کے متعلق جس کے نصاب میں اردو زبان ذریعۂ تعلیم ہو اور انگریزی زبان کی تحصیل لازمی، مجھے تعلیمی نقطۂ نظر سے غائب معلوم ہوتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اکثر ہندستانی طالب علم جن کا انگریزی زبان کا علم ناقص ہوتا ہے جب وہ یونیورسٹی میں آتے ہیں تو لامحالہ ان کی تعلیم مثل کل کے ہوتی ہے ۔ یہ طالب علم اپنے لکچروں کو حفظ کر لیتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ اس زبان میں غور و فکر کرنے کے ناقابل ہوتے ہیں ۔ جس میں انہیں لکچر دئیے جاتے ہیں ۔ اس کا اطلاق نہایت ذہین اور ہوشیار طلبہ پر نہیں ہوتا ، لیکن اکثر کا حال یہی ہے ۔"

سر مائیکل وڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی رائے

سر مائیکل وڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب جو سابق میں ریاست حیدرآباد میں رزیڈنٹ بھی رہ چکے ہیں ۔ اون کی ذاتی قابلیت علمی اور نیز یہاں کے حالات سے واقف ہونے کے لحاظ سے ان کی رائے بالخصوص وقعت رکھتی ہے یہ رائے انہوں نے مسٹر گلانسی معین المہام فینانس کے استفسار پر لکھ کر بھیجی ہے :

"میری رائے (جس کے متعلق مجھے کبھی توقع نہ تھی کہ حیدرآباد تک پہنچے گی) مدارس ثانویہ کی تعلیم کے متعلق تھی۔ ہمارے ماہران تعلیم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ طالب علم جن کی تعلیم دیسی زبان میں اچھی طرح ہوئی ہے اور جنھوں نے

صرف اسکول فائنل کا امتحان پاس کیا ہے وہ ہمارے
مدارس کے بہترین طلبہ ہیں ۔ وہ بحیثیت مجموعی ان طالبعلموں
سے بہتر ہیں جنہوں نے اپنی تعلیم غیر زبان کے ذریعہ سے حاصل
کی ہے جسے پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے ۔

" بلاشبہ اسی اصول کا اطلاق کسی قدر کم قوت کے ساتھ
تعلیم یونیورسٹی پر بھی ہوتا ہے ۔ کیونکہ غالباً جوں جوں غیر زبان
کا علم زیادہ ہوتا جائیگا ۔ طالبعلم کی استعداد قوی ہوتی جائیگی
لیکن باستثنائے ان چند کے جن میں خداداد قابلیت ہے
عام طور پر یہ حالت ہے کہ غیر زبان کے ذریعہ سے تحصیل
علوم میں جو جد وجہد کرنی پڑتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہیکہ
اس کی دماغی قوت کا غیر معمولی حصہ اس میں صرف ہو اور
مضمون زیر تعلیم میں آزادانہ اور معقول قوت استدلال کی
قابلیت کم ہو جائے ۔

" عام اصول کی بناء پر آپ کی اس تجویز کے متعلق کہ
تعلیم یونیورسٹی آپ کی دیسی زبان یعنے اردو کے ذریعہ سے
جو آپ کی سرکاری زبان بھی ہے) دی جائے بہت کچھ کہا
جاسکتا ہے ۔

" لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو اُن دو
نوٹوں میں جو اس میں ملفوف ہیں اور جو ہمارے ناظم تعلیمات
مسٹر گاڈلے اور مسٹر ولز پرنسپل اورینٹل کالج کے تحریر کردہ
ہیں دکھایا گیا ہے ۔ ان میں اعلیٰ تعلیم کو کسی ایسی زبان کے
ذریعہ سے دینے کی مشکلات کو ظاہر کیا گیا ہے جسکا ذخیرہٗ
الفاظ اس قدر کافی نہیں ہے کہ تمام جدید خیالات کو ظاہر کرسکے
اور جس میں ضروری کتب نصاب موجود نہیں ہیں ۔

"ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ مشکلات کے متعلق مبالغہ کیا جاتا ہے اور جاپان کی مثال حیدرآباد کے حالات کے بالکل مناسب ہے۔ مجھے کبھی کسی ایسے جاپانی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو فصیح انگریزی دانی یا گفتگو میں ہندستان کے اچھے تعلیم یافتہ کے مساوی ہو لیکن باوجود اس کے اور شاید اسی کمی کی وجہ سے، وہ ان اصحاب کے مقابلہ میں جو ہماری یونیورسٹیوں کے مایۂ ناز ہیں دماغی و ذہنی لحاظ سے زیادہ مستعد ہوتا ہے اور اس میں آزادانہ استدلال کی قابلیت کہیں زیادہ ہوتی ہے"

مسٹر گلانسی معین المہام فینانس کی رائے

مسٹر گلانسی۔ آئی۔ سی۔ یس معین المہام فینانس جو بلحاظ اپنے وسیع تجربہ و ہندستان کے حالات سے واقفیت علمی دلچسپی و ذاتی قابلیت کے اس مسئلہ میں صائب اور دور اندیشانہ رائے دے سکتے ہیں۔ انہوں نے سرمائیکل وڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی رائے کو ارسال کرتے ہوئے اس معتمد کو یہ مراسلہ لکھا ہے جس میں انہوں نے مالی پہلو پر بھی اپنی تائید سے کامل اطمینان اور یقین دلایا ہے۔

"میں ہمیشہ سے اس بات کا مؤید ہوں کہ ذریعۂ تعلیم ملکی زبان ہونی چاہیئے۔ اور جب میں اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میری تعلیم بالکل ایک غیر زبان کے ذریعہ سے ہوتی تو میں تحصیل علم اس حد تک کبھی نہ کرسکتا۔ اس بارے میں میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا، لیکن میں سرمائیکل وڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کے خط کی ایک نقل بھیجتا ہوں جس میں انہوں نے بہت واضح طور سے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ دیسی زبان اعلیٰ تعلیم تک کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگریزی

زبان ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں سے خارج کردی جائے۔ انگریزی کی تعلیم بحیثیت زبان دیجائیگی مگر وہ دوسرے علوم کی تحصیل کے لئے ذریعہ تعلیم نہ ہوگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر انگریزی زبان کی تعلیم بحیثیت زبان کے صرف مروجہ جدید زبان انگریزی تک محدود رکھی جائے، جو اس وقت ہندستان کے مدارس اور یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتا، تو یہ طالب علم ہماری موجودہ یونیورسٹیوں کے معمولی طلبہ کے مقابلہ میں روزمرہ کے معاملات زندگی میں بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ انگریزی لکھ اور پڑھ سکیں گے۔ انگریزی آج کل تجارت اور دوسرے پیشوں کے لئے اس قدر ضروری ہے کہ اگر کسی اسکیم میں انگریزی کی تعلیم خارج کردی جائے تو میرے خیال میں وہ کبھی بارآور نہیں ہوسکتی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ریاضیات، تاریخ، سائینس ودیگر علوم طالبعلموں کو ان کی اپنی زبان میں نہ پڑھائے جائیں۔ خواہ اس تجربہ میں کامیابی ہو یا ناکامیابی (اور میرا خیال ہے کہ اگر احتیاط سے کام کیا گیا تو ضرور کامیاب ہوگا) مگر ہے یہ آزمائش کے قابل۔ کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد ہندستان کے دوسرے صوبوں سے تعلیم میں پیچھے ہے۔ مگر اس تجربہ کو نہایت شوق اور غور سے دیکھا جائے گا۔ اور اگر کامیاب ثابت ہوا تو تمام ہندستان میں اسکی تقلید کی جائیگی۔

• ابتدار میں نصاب تعلیم کے مرتب کرتے، کتب نصاب کے ترجمہ کرنے یا اسی قسم کے دوسرے بہت سے کام کرنے ہونگے جہاں تک محکمۂ فینانس کا تعلق ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ہر ممکن طریقہ سے اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دینگے

اور ابتدائی کاموں کے لئے جس قدر اخراجات کی ضرورت
ہوگی میں اسکی تائید کروں گا"

مجوزہ یونیورسٹی کے خصائص و فوائد

یہ چند قابل وقعت رائیں اس خیال کی تائید میں کافی ہیں عموماً تمام ماہران تعلیم اس قسم کی یونیورسٹی کے قیام کے حامی و مؤید ہیں اور ملک کے لئے نیک فال اور موجب برکت خیال کرتے ہیں۔

یہ یونیورسٹی اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی ہوگی اس میں جدید و قدیم، مشرق و مغرب، فلسفہ و سائنس، دین و دنیا دونوں کا اس طور سے امتزاج ہوگا کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص رفع ہو جائیں اور قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو۔ اس میں دماغ و جسم دونوں کی تربیت کامل طور سے کی جائے گی اور اس تربیت و تعلیم کی بنیاد ملکی ضروریات قومی خصائص اور ہمارے روایات مقدسہ پر ہوگی۔ اس میں جہاں ملک میں عام طور پر علم پھیلانے کی کوشش کی جائے گی وہاں ساتھ ساتھ خاص خاص علمی شعبوں میں تحقیق کا کام بھی جاری رہیگا اور شعبہ تالیف و تراجم کے ذریعہ سے اپنی زبان میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائی جائینگی اس کے فارغ التحصیل نہ صرف عمدہ مترجم بلکہ اعلیٰ درجہ کے مصنف و محقق بھی ہوں گے وہ نہ صرف سرکاری دفاتر کے عمدہ منشی اور قابل عہدہ دار ہوں گے بلکہ ملک کے حقیقی بہی خواہ اور سرکار کے سچے وفادار بھی ہوں گے اور ملک میں روشن خیالی صداقت اور حب وطن کے خیالات پھیلائیں گے۔ یہ یونیورسٹی سرکار عالی کی رعایا میں بلالحاظ مذہب و ملت اخوت و اتحاد کے خیالات کو مستحکم کرے گی اور سرکار عالی کی رعایا کو فیض علم کی بدولت سلطنت ہند کی رعایا کے ساتھ اون تمام تحریکات میں جن سے اخلاقی و مادی ترقی متصور ہے دوش بدوش رکھے گی۔ اور یہ یونیورسٹی ایک ایسے جدید تمدن کی بنا ڈالے گی جو مشرق و مغرب کی خوبیوں کا آئینہ اور ہمارے درد کا درمان اور ہمارے ضعف کا علاج ہوگی۔ یہ یونیورسٹی برکات عہد عثمانیانی کی سب سے بڑی اور اہم یادگار ہوگی اور سب سے زیادہ پائدار سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ رفیع القدر اور مبارک خیال کی جائے گی۔ حضرت اقدس و اعلیٰ کا نام ہر دور میں نسلاً بعد نسل فخر و مباہات کے ساتھ لیا جائیگا اور اس کا فیض ملک کے گوشہ گوشہ میں نور کی طرح پھیلیگا۔ یہ خیر جاری اور فیض ابدی ہوگا۔ جس سے نہ صرف یہی ریاست بلکہ سارا ملک

مستفیض ہوگا اور اسکی تقلید ہندوستان کے ہر حصّے میں کی جائے گی۔ یہ پہلی کوشش ہوگی جو ہمارے اپنے غور وفکر کا نتیجہ ہوگا۔ اور جس میں اصلیت اور جدّت کی بو پائی جائے گی ۔ یہ پہلی سعی ہوگی جس میں محض نقالی اور دوسروں کے خیالات کی غلامی سے آزادی نصیب ہوگی ۔ یہ ریاست ہمیشہ سے سرپرست علم اور قدر دان ہنر رہی ہے۔لیکن علم وفضل کی حقیقی بنیاد حضور پر نور ہی کے عہد میں اور حضور ہی کے ہاتھوں قائم ہوگی ۔ اس میں بھی خداوند جل شانہٗ کی حکمت تھی کہ اس سرچشمہ فیض کی بنا اعلحضرت واقدس جیسے روشن خیال دوربین اور مدبر فرمانروا کے لئے ودلیعت رکھی گئی تھی ۔ اعلحضرت واقدس کا فرمان منظوری علم وحکمت کا چارٹر خیر و برکت کا پروانہ اور ملک کی فلاح وبہبودی کی سند ہوگا ۔

محمد اکبر حیدری

ضمیمہ (۱)

فرمان واجب الاذعان ترشدہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ

ملاحظہ عرضداشت صیغۂ تعلیمات معروضہ ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ جس کے ساتھ ایک یادداشت گزرانی گئی ہے۔ جس میں ہز اکسلنسی دی وائسرائے کی ایک اسپیچ کے اقتباس کے ساتھ چند عمائدین و مدبرین کے آرا کی نقل کرکے حیدرآباد کے خاص حالات کے لحاظ سے یہاں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت و مناسبت بتائی گئی ہے۔

حکم۔ مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کے مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کیلئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہوکر جسمی و دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبار کے اخلاق کی درستگی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو کو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولۂ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کیلئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی" حیدرآباد ہوگا اور ہر اہم و اصولی امر کی نسبت جو اس کارروائی میں پیدا ہو صراحت کرکے میری منظوری وقتاً فوقتاً حاصل کی جاتی رہے۔

شرحدستخط مبارک
۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ پنجشنبہ
شرحدستخط امین جنگ (بہادر)

ضمیمہ (۲)

عرضداشت

معروضہ ۲۴ر شوال المکرم ۱۳۳۵ھ م ۷ مہر ۱۳۲۶ف م ۱۳ر اگست ۱۹۱۷ء

دربارۂ قیام دارالترجمہ

بہ پیشگاہ بندگان اعلیحضرت پیر و مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی مدظلہم العالی خلد اللہ ملکہٗ

بعد از آستاں بوسی مودبانہ عرض ہے کہ

بہ تعمیل فرمان واجب الاذعان مترشدہ ۴ر رجب المرجب ۱۳۳۵ھ نسبت قیام عثمانیہ یونیورسٹی معتمد تعلیمات نے حسب ذیل گذارش پیش کی ہے :-

باتباع فرمان مبارک نصاب تعلیم یونیورسٹی و دیگر امور متعلقہ کے بارے میں کام جاری ہے لیکن جو چیز سب سے مقدم اور ضروری ہے اور جس پر یونیورسٹی اور اس کی تعلیم کا دارومدار ہے وہ شعبۂ تالیف وتراجم ہے۔ اس شعبہ کے متعلق فدوی اپنے نوٹ متعلقہ قیام یونیورسٹی میں مفصل ذکر کرچکا ہے لیکن یہاں مختصراً اس قدر گزارش کردینا مناسب ہے کہ ہرفن وعلم کی کتب نصاب تعلیم جو یونیورسٹی کے مختلف مدارج اور امتحانات کے لئے مقرر کی جائیں گی اُن کا اُردو زبان میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ جب تک یہ کتابیں تیار نہ ہوں گی تعلیم یونیورسٹی کا آغاز دشوار ہے۔ چونکہ اس تعلیم اور ان امتحانات کے لیے مختلف علوم وفنون کی متعدد کتب کی ضرورت دائماً رہے گی۔ نیز

اس یونیورسٹی کا ایک بڑا مقصد اس ملک میں اشاعت علوم ہوگا لہذا مستقلاً ایک ایسے شعبہ کا قیام موجب برکات گوناگوں ہوگا۔

علوم وفنون کو اپنی زبان میں لانے اور ملک میں اشاعت علم و ہنر کی یہ پہلی کوشش ہوگی جو بڑے پیمانہ پر اس ملک میں سرکار عالی کی جانب سے کی جائے گی اور جس کے فوائد اور منافع نسلاً بعد نسل زمانہ دراز تک اہل ملک کو پہنچیں گے اور بلحاظ افادہ و اہمیت و ضرورت یہ کام علمی دنیا میں ایسا عظیم الشان ہوگا جس کی نظیر تمام ہندوستان میں کہیں نہیں پائی جاتی۔

یہ کام جس قدر اعلیٰ اور مفید ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ اس لئے ہمیں اس شعبہ کے لئے بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص تلاش کرنے پڑیں گے جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ اُردو فارسی اور عربی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہوں تاکہ وہ اپنے خیالات کو انگریزی زبان سے اُردو میں بطریق احسن ادا کرسکیں اور ظاہر ہے کہ ایسے اہل علم اور اہل قلم اصحاب کا دستیاب ہونا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کی منظوری کے بعد ہی سے مختلف ذرائع سے ایسے اصحاب کی تلاش جاری ہے۔ بعض نے یہاں آنا اور شعبہ میں کام کرنا منظور کرلیا ہے اور بعض سے خط وکتابت ہورہی ہے اور ابھی قطعی جوابات وصول نہیں ہوئے۔

اسکیم متعلقہ سررشتہ ترجمہ اس شعبہ کے متعلق جو اسکیم بمشورہ ناظم صاحب تعلیمات و دیگر اہل الرائے مرتب کی گئی ہے اور جس کا تختہ بغرض منظوری اس گذارش کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ کم ازکم ہر فن کے لئے جس کی تعلیم یونیورسٹی میں ضروری ہے اور جس کے متعلق کتابیں اُردو زبان میں موجود نہیں ہیں، ایک ایک مترجم اس شعبہ میں ملازم رکھا جائے۔ اس لحاظ سے سائنس کے لئے جس کی مختلف شاخیں ہیں اور جس کا ترجمہ سب سے مشکل ہے، دو مترجم تجویز کئے گئے ہیں۔ ریاضیات کے لئے ایک، فلسفہ کے لئے ایک، پولٹیکل سائنس (سیاسیات) کے لئے ایک اقتصادیات (اکنامکس) کے لئے ایک، تاریخ کے لئے ایک۔ اور قانون کے لئے ایک مترجم تجویز ہوا ہے۔

صراحت تنخواہ مترجمین و طریقۂ ترجمہ ذریعۂ اُجرت | مترجمین کی یہ تعداد کم سے کم ہے جو ناگزیر ہے۔ ان کی تنخواہیں وہی ہوں گی جو بمشورۂ معین المہام بہادر فینانس اسسٹنٹ پروفیسروں کی قرار دی گئی ہیں۔ یعنی ۲۰۰ تا ۵۰۰ تاکہ جب ضرورت ہو تو ان میں سے کسی مناسب شخص کا تقرر اسسٹنٹ پروفیسری پر کر دیا جائے اور اسسٹنٹ پروفیسری میں سے جو ترجمہ کی قابلیت رکھتا ہو اسی شعبہ میں منتقل کیا جا سکے۔ اس سے آئندہ کام میں بڑی سہولت واقع ہوگی۔ البتہ تختہ تقررات میں دو صاحبوں کے ساتھ خاص رعایت کی گئی ہے، ایک صاحب قاضی محمد حسین ہیں جو کیمبرج یونیورسٹی کے رینگلر اور ۵۰۰ سے کم پر آنے کے لئے راضی نہیں اور بلحاظ اعلیٰ قابلیت وہ اس تنخواہ کے مستحق ہیں لہذا ان کو انتہائی گریڈ دیا گیا ہے۔ دوسرے چودھری برکت علی بی۔ ایس۔ سی، اسسٹنٹ پروفیسر سائنس علیگڈھ کالج، جو وہاں دوسو کلدار پاتے ہیں اور یہاں بلحاظ حالات و بعد مسافت ۴۰۰ حالی سے کم پر نہیں آنا چاہتے لہذا ان کی تنخواہ کا گریڈ ۴۰۰ تا ۵۰۰ رکھا گیا ہے۔ ان صاحبوں کا تقرر ایک سال کے لئے امتحاناً ہوگا۔ چونکہ ابتدا میں بہت سی کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت پڑے گی اور مترجمین کا مجوزہ عملہ اس کے لئے کافی نہ ہوگا، کیونکہ ہر فن کے لئے صرف ایک شخص تجویز کیا گیا ہے، لہذا اس خیال سے کہ سرکار پر دائماً اخراجات کا زیادہ بار نہ پڑے یہ قرار پایا ہے کہ ابتداءً تین چار سال تک کتابیں غیر اشخاص سے اُجرت پر بھی ترجمہ کرائی جائیں جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ مجوزہ کتب کے تراجم کے متعلق اخبارات میں اشتہار دیئے جائیں گے اور ترجموں کے نمونے طلب کئے جائیں گے جن کے ترجمے سب سے بہتر پائے جائیں گے اُنہیں کے سپرد یہ کام کیا جائے گا اور اس کی انہیں معقول اُجرت دی جائے گی۔ اس غرض کے لئے مد اجرت طبع میں پہلے سال کے لئے دس ہزار روپیہ رکھے گئے ہیں تاکہ آیندہ سال تجربہ کے بعد اس میں کمی بیشی کی درخواست کی جائے۔

ناظم سررشتہ ترجمہ اور ان کے موجودہ کام کا انتظام

اس شعبہ کی نگرانی و انتظام کے لئے ایک ایسے شخص کی
ضرورت ہے جو علاوہ زبان داں ہونے کے اُردو کا مسلم انشاپرداز ہو، نظر تحقیق و
تنقید رکھتا ہو اور ترجمے کے فن اور اس کی مشکلات سے بخوبی واقف ہو تاکہ جو
ترجمے اس شعبہ کی طرف سے شائع ہوں وہ مستند خیال کئے جائیں اس خدمت
کے لئے مولوی عبدالحق بی۔ اے مہتمم تعلیمات اورنگ آباد سے زیادہ موزوں اور اہل
کوئی دوسرا شخص نہیں نظر آتا۔ اُن میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اس خدمت
کے لئے ضروری ہیں لیکن فی الحال اورنگ آباد کے مخصوص حالات کی وجہ سے
انہیں اورنگ آباد سے علحدہ کرنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا جب تک کوئی دوسرا
شخص ایسا نہ مل جائے جو اُن کے کام کو قابل اطمینان طور سے سنبھال سکے۔ اس
خدمت کی تنخواہ ۵۰۰ ـ ۵۰ ـ ۱۰۰۰ قرار دی گئی ہے اور یہ تجویز کی گئی ہے کہ
اس گنجائش سے فی الحال دوسو روپیہ ماہانہ پرسنل الونس، مولوی عبدالحق کو
اس خدمت کی انجام دہی کے لئے دیا جائے اور ۲۰۰ ـ ۱۰ ـ ۳۰۰ کا ایک عہدیدار
(جو مہتمم تعلیمات درجۂ دوم کا گریڈ ہے) بطور مددگار کے مولوی عبدالحق کو دیا جائے کہ
وہ انہیں تعلیمی معاملات میں مدد دے اور دورہ بھی کرے۔ اس سے جو مولوی عبدالحق
کا وقت بچے گا وہ اس خدمت کے سرانجام دینے میں صرف کریں گے۔ ترجمے برابر اُن
کے پاس پہنچتے رہیں گے اور وہ اُن کی تصحیح و ترتیب میں مشغول رہیں گے اور کم سے
کم مہینے میں ایک ہفتہ انہیں حیدرآباد میں آکر رہنا پڑے گا تاکہ وہ اس شعبہ کے متعلق
کمیٹیاں منعقد کریں، اصطلاحات و الفاظ علمیہ کے متعلق مشورہ کرکے کوئی خاص رائے
قائم کریں اور طبع وغیرہ کے متعلق جو انتظامات ہوں انہیں سرانجام دیں۔ اس طرح
اس شعبہ کا کام بھی قابل اطمینان طور پر انجام پاتا رہے گا اور اورنگ آباد کی تعلیم
کا بھی۔ جب اُن کے مددگار کو اورنگ آباد کی تعلیمی حالات و انتظامات کا کافی تجربہ
ہوجائے گا تو اُس وقت مولوی عبدالحق کو اس شعبہ میں مستقل طور پر منتقل کرلیا جائے
گا۔ علاوہ اس کے اس صورت میں تقریباً ۳۶۶ ماہانہ کی بچت ہوگی۔

عملہ سررشتۂ ترجمہ | ہر مترجم کے ساتھ ایک ایک مبیضہ نویس کا تقرر تجویز کیا گیا ہے تاکہ جس قدر ترجمہ کا کام ہوتا جائے مبیضہ نویس اُسے صاف اور اچھے خط میں نقل کرتا جائے جو ناظم شعبہ کی نظر سے گذرنے کے بعد طبع کے لئے دیا جائے۔ مبیضہ نویسوں کی تنخواہ ۳۰ ـ ۴ ـ ۵۰ قرار دی گئی ہے۔

دفتری کاروبار اور حسابات کے لئے دو محرر تجویز کئے گئے ہیں ایک کی تنخواہ ۸۰ تا ۱۰۰ اور دوسرے کی ۶۰ تا ۸۰ ہوگی جن میں سے ایک خاص طور پر حسابی لیاقت اور دوسرا انگریزی داں ٹائپ رائٹری کا کام جاننے والا ہوگا۔

ان کے علاوہ دو چپراسی ایک فراش اور ایک دفتری معمولی تنخواہوں کے تجویز کئے گئے ہیں۔

اخراجات صادر وغیرہ | اخراجات صادر میں کاغذ قلم دوات کے لئے ماہوار ۲۰۰ کرایہ مکان ماہوار ۱۲۵ طبع کتب کے لئے ماہوار ۶۵۰ اور خرید کتب کے لئے ماہوار ۱۰۰ ماہانہ درج تختہ کئے گئے ہیں۔

یہ تمام اخراجات مستقل ہیں جن کی میزان ۵۶۲۵۶ تا ۸۰۳۶۴ سالانہ ہوتی ہے۔ علاوہ ان کے پہلے سال کے لئے اخراجاتِ یکمشت میں اجرت ترجمہ کے لئے دس ہزار (اس کی ضرورت اوپر ظاہر کی جا چکی ہے) خرید فرنیچر کے لئے دو ہزار اور کتب کے لئے چار ہزار کی ضرورت واقع ہوگی۔

اختتام گذارش معتمدی عدالت وکوتوالی وامورعامّہ (صیغۂ تعلیمات) | ان تمام اخراجات کا تخمینہ نہایت غور وخوص کے بعد قائم کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اخراجات کے صرف وہی مدات رکھے جائیں جو بہت ضروری اور ناگزیر ہیں اور کسی قسم کا کوئی زائد بار سرکار پر نہ ڈالا جائے۔ غور کیا جائے تو اُن عظیم الشان فوائد کے مقابلے میں جو اس سے مترتب ہوں گے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ہے۔ قطع نظر ان فوائد کے جو یونیورسٹی کو اس سے حاصل ہوں گے۔ یہ شعبہ بذات خود ایک چشمۂ فیض ہوگا جس سے ملک میں علم کی اشاعت ہوگی لوگوں میں صحیح علمی اور ادبی ذوق پیدا ہوگا اور تربیت دماغ،

ذوقِ سلیم اور عقلی و ذہنی استعداد کی تکمیل میں بہت ممد و معاون ہوگا۔

ایسے جلیل القدر اور مہتم بالشان علمی کام صرف ریاستوں اور سلطنتوں کی شاہانہ امداد کی بدولت انجام پا سکتے ہیں دولتِ آصفیہ کا یہ کارنامہ بجرماجیت، خلافتِ عباسیہ اور اکبر کے عہد کو پھر تازہ کر دے گا۔

لہٰذا بادب گذارش ہے کہ اگر عالیجناب اسے منظور فرمالیں تو بذریعۂ محکمۂ فینانس باتباع فرمان واجب الاذعان اعلیحضرت و اقدس کی منظوری حاصل کی جائے۔

رائے خانہ زاد

اس پر خانہ زاد نے یہ رائے دی تھی کہ تجاویز پیش شدہ خانہ زاد کی رائے میں بھی مقبول ہیں۔ بتوسط محکمہ فینانس منظوری حاصل کی جائے۔

حسبِ اصل گزارش محکمۂ معتمدی عدالت و کوتوالی و امورِ عامہ دفتر فینانس پر بھیجی گئی اور اس پر مسٹر گلنسی نے بھی شعبۂ ترجمہ کے اسکیم جدید سے اتفاق کرکے اپنی رائے بالفاظ ذیل ظاہر کی ہے:۔

رائے معین المہام فینانس

"بمد نظر فرمان اقدس جو اس بارہ میں شرف صدور لایا ہے تجاویز مندرجہ گذارش ہذا ضروری اور مناسب معلوم ہوتی ہیں معین المہام فینانس کو اس شعبۂ ترجمہ کے اسکیم سے اتفاق ہے۔ لہٰذا حسبہٖ منظوری صادر فرمائی جائے تو مناسب ہوگا۔ جب اس کا کافی عملی تجربہ مرورِ زمانہ سے حاصل ہو جائے گا تو اس وقت دیکھا جا سکتا ہے کہ آیا اس میں کسی قسم کی اصلاح یا ترمیم اور ردوبدل کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

اب اس بارہ میں جیسا ارشاد خداوندی شرف صدور لائے شایانِ تعمیل ہے فقط
الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال و ائماً تاباں و درخشاں باد

عرضی

خانہ زاد موروثی فخر الملک

محمد اکبر حیدری

معتمد عدالت و کوتوالی و امورِ عامہ سرکارِ عالی

عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۴۸ء کے بعد

عثمانیہ یونیورسٹی کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس کی خدمات ہمیشہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رہی ہیں۔ بانیٔ جامعہ کی بھی یہی آرزو تھی کہ یہ دانش گاہ عصری علوم و فنون' تعلیم و تربیت کا اہم مرکز رہے۔ عثمانین جہاں اپنی مادر علمیہ کے شاندار ماضی پر ناز کرسکتے ہیں وہیں ان کا حوصلہ افزا حال اور تابناک مستقبل ان کے لئے باعث افتخار ہے

اس درسگاہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے ان کی مختلف ادوار میں تقسیم ناگزیر ہے۔ ۷۰ سال کے طویل سفر کے دوران کئی سنگ میل ایک ایک منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر رضی الدین سابق وائس چانسلر " عثمانیہ یونیورسٹی کا ابتدائی دور ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۸ء دور تاسیس' ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء کا دبا استحکام کا دور اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء کا دور تنظیم جدید کا اور اس کے بعد کا دور توسیع و ترقی کا دور ہے۔"

ابتدائی ۳۰ سال کا دور بلاشبہ دور زرّیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ برطانوی تسلط کے دوران سارے ہندوستان میں انگریزی کے فروغ کا دور دورہ تھا۔ ہر شعبۂ حیات میں انگریزی کے رواج کو فروغ دیا جارہا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ہندستانی زبان اُردو کو نہ صرف آرٹس' سائنس' انجینئرنگ' میڈیسن اور قانون جیسی فیکلٹیز میں اُردو ذریعۂ تعلیم کا کامیاب تجربہ کیا جو آج بھی سارے ملک کے لئے ایک مثالی اور قابلِ تقلید ہے۔

۱۹۴۸ء کے بعد کا دور عثمانیہ یونیورسٹی کے ابتدائی دور سے یکسر مختلف ہوگیا۔

سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ اس تعلیمی ادارہ کی سرگرمیوں، اس کے بنیادی ڈھانچہ نصب العین اور مقاصد میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

"جامعہ عثمانیہ" عثمانیہ یونیورسٹی بن گئی۔ اس نام کی واحد یادگار جو اب برقرار ہے، وہ ریلوے اسٹیشن ہے جو آج بھی "جامعہ عثمانیہ ریلوے اسٹیشن" کہلاتا ہے۔ یونیورسٹی کا نشان امتیازی تبدیل ہوگیا۔ ایمبلم میں تاج شاہی اور نور علیٰ نور کے الفاظ باقی نہیں رہے۔ "انا مدینۃ العلم و علی بابھا" کے الفاظ کی جگہ ہندی زبان میں عثمانیہ یونیورسٹی کا نام، عربی رسم الخط میں جامعہ عثمانیہ کی جگہ تلگو زبان میں عثمانیہ یونیورسٹی کے الفاظ نے لے لی۔ اس نشان کی بنیادی صورت گری حرف ع کے ساتھ برقرار ہے۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں ریاست میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کی اولین کلیہ نظام کالج کے انضمام کے ساتھ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں اُردو کی جگہ انگریزی میڈیم کا رفتہ رفتہ رواج شروع ہوا۔

۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے قیام کے ساتھ مرکزی امداد کے حصول کی راہیں ہموار ہوگئیں اور قومی مقاصد کی تکمیل یونیورسٹی کے فرائض میں داخل ہوگئی۔ سائنس، سوشیل سائنس، انجینئرنگ کے کئی نئے شعبہ قائم ہوئے۔ آسٹرانومی علم فلکیات کو رصدگاہ نظامیہ کی سہولتوں کے باعث فروغ حاصل ہوا۔ زرا عت بائیو کیمسٹری، جیو فزکس کے علاوہ جرنلزم، لائبریری سائنس اور پبلک اڈمنسٹریشن جیسے مضامین کی پوسٹ گر-یجویٹ تعلیم کے فروغ کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ یونیورسٹی میں بعض ایسے شعبوں میں تعلیم اور ریسرچ کا آغاز ہوا جو سارے ملک میں اپنی نوعیت کے منفرد تھے، ان میں آسٹرانومی کے علاوہ مائننگ انجینئرنگ اور جینیٹکس شامل ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں قائم شدہ شعبۂ جینیٹکس انتہائی عصری آلات سے لیس لیبارٹری کے

باعث ریسرچ کی بہترین سہولتیں مہیا کر رہا ہے نیز لیب کے تقاضے۔ ریسرچ اور علاج
اس شعبہ کی اہم سرگرمیاں ہیں۔ انجینئرنگ کے شعبہ میں کمپیوٹر ٹکنالوجی کا آغاز
بھی عثمانیہ یونیورسٹی کو ملک کی دوسری یونیورسٹی سے ممتاز اور منفرد کرتا ہے

انقلابی تبدیلیاں

۷۰ سال کے اس طویل سفر کے دوران یونیورسٹی کو بلاشبہ بعض مراحل پر انتہائی صبر آزما حالات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ عوامی حکومت کی تشکیل کے بعد یونیورسٹی نظم و نسق حکومت وقت کے مقررہ مقاصد کی تکمیل کا پابند ہو گیا۔ یونیورسٹی نظم و نسق کی خود اختیاری رفتہ رفتہ حکومت وقت کے مقررہ دائروں تک محدود ہوتی گئی۔ حیدرآباد کی حکومت نے یونیورسٹی نظم و نسق پر نگرانی اور کلیدی پالیسی فیصلوں کے لئے سینٹ اور سنڈیکیٹ کی تشکیل پر مبنی ایک ایسا ڈھانچہ مرتب کیا جس میں ماہرین تعلیم کے ساتھ ساتھ عوامی نمائندوں کو بھی یونیورسٹی نظم و نسق سے متعلق کلیدی فیصلوں کے سلسلہ میں اپنی رائے دینے کے مواقع مہیا کئے گئے۔ سینٹ کے لئے اسمبلی اور کونسل کے ارکان کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو نامزد کیا جاتا رہا اور یونیورسٹی کے قدیم گریجویٹس کو سینٹ کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا یہ ڈھانچہ آندھرا پردیش کے قیام کے بعد بھی کانگریس کے دور حکومت میں برقرار رہا۔ ۱۹۸۳ء میں تلگودیشم حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد یونیورسٹی کے پالیسی ساز اداروں سینٹ اور سنڈیکیٹ کے بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلی آئی۔ اسمبلی سے ارکان کی نامزدگی کے علاوہ حلقہ گریجویٹس سے سینٹ کے لئے ارکان کے انتخاب کا طریقہ بھی ختم کر دیا گیا سنڈیکیٹ اور سینٹ کی بجائے اگزیکیٹیو کونسل اور اکیڈیمک سینٹ نے لی۔ ۱۹۸۶ء میں منظورہ قانون کے تحت اس کونسل اور

سنیٹ کی تشکیل مکمل طور پر نامزدگی کی بنیاد پر عمل میں آرہی ہے اس طرح یونیورسٹی کے تمام پالیسی ساز مجالس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہوگیا کیونکہ تمام ارکان کی نامزدگی حکومت کی مرضی اور منشا کے مطابق ہی عمل میں آرہی ہے۔

یونیورسٹی نے بلاشبہ ترقی و توسیع کی کئی اہم مراحل کی تکمیل کی لیکن ایسے مراحل کا بھی سامنا کرنا پڑا جن کے تلخ حقائق کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی وائس چانسلر کے دور میں جو ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۹ء ۱۲ سال تک جاری رہا۔ ایک مرحلہ پر جب ڈاکٹر ریڈی اور اس وقت کے چیف منسٹر مسٹر کے برہمانندا ریڈی کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کو بدترین مالیاتی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹی کو اپنے اسٹاف کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے بنکوں سے اوور ڈرافٹس کی حدوں کو عبور کرنے کے بعد بعض تمسکات کی کفالت سے قرض حاصل کرنا پڑا۔

۱۹۷۵ء کے بعد کا دور عثمانیہ یونیورسٹی کی بقاء استحکام اعتماد کی بحالی کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ افراتفری سے متاثر اس یونیورسٹی کو راہ راست پر لانے اس کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے مقصد سے جامعہ ہی کے ایک فرزند مسٹر جسٹس پی جگن موہن ریڈی سابق چیف جسٹس نے وائس چانسلر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کچھ اپنی شخصیت کے رعب و دبدبہ کے ذریعہ اور انتظامی امور میں دیرینہ تجربہ کو روبہ کار لاتے ہوئے حالات کو معمول پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ ایسی اصلاحات نافذ کیں جن کی بدولت یونیورسٹی تعلیم بامقصد ہوگئی اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کی ساکھ بحال ہوگئی۔ پروفیسر جی رام ریڈی نے اس تسلسل کو برقرار رکھا۔ ۱۹۸۳ء میں جناب ہاشم علی اختر آئی اے ایس نے وائس چانسلر کا عہدہ

سنبھالنے کے بعد طلبا کی نئی نسل میں مادرِ علمیہ کی اعلیٰ قدروں کی پاسبانی کا شعور پیدا کیا اور ان میں اس رجحان کو فروغ دیا کہ وہ نئی کی ایسی اعلیٰ قدروں کے محافظ اور امین ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ جناب ہاشم علی اختر نے یونیورسٹی کیمپس کے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے بھی بعض اہم اقدامات کئے اور چمن بندی کے ذریعہ آرٹس کالج کے سامنے کے وسیع علاقہ کو خوبصورت سبزہ زار میں تبدیل کردیا۔ انہیں ڈسپلن کی برقراری کے سلسلہ میں صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن مادرِ علمیہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کے جذبہ کے تحت انہوں نے خدمات انجام دیں اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں پروفیسر ٹی نونیت راؤ نے جناب ہاشم علی اختر سے جائزہ حاصل کیا۔ انکے قائم کردہ بعض نئے پراجکٹوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اقدامات کرتے ہوئے تسلسل کو برقرار رکھا ان میں یونیورسٹی ویلفیر فنڈ کا قیام اور ویژن آف عثمانیہ کی توسیع شامل ہے۔

پروفیسر نونیت راؤ نے تعلیمی نظام الاوقات کو معمول پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ اور تعلیمی کیلنڈر کی موثر عمل آوری کی راہیں ہموار کردیں۔ چنانچہ کئی برسوں بعد پہلی مرتبہ امتحانات اپریل / مئی کے دوران منعقد ہوئے۔

گذشتہ ربع صدی کے دوران سارے ملک میں تعلیم خاص طور پر کالیجی اور جامعاتی تعلیم کے غیر معمولی فروغ کے نتیجہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دائرہ عمل اور ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی جس کا شمار آج سارے ملک کی ۱۰ بڑی جامعات میں ہوتا ہے اور طلبا کی تعداد اور کورسس کی نوعیت کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی قرار دی جاتی ہے۔ (۷۰) سال قبل ۲۲۵ طلبا اور ۲۵ اساتذہ کے ساتھ جس ادارہ کا آغاز ہوا تھا وہ آج ایک لاکھ

۲۵ ہزار طلباء و طالبات کی ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ کی خدمات میں مصروف ہے ۔ نظام عثمانیہ یونیورسٹی کے اپنے (۷) کیمپس کالجس اور کیمپس کے باہر خدمات انجام دینے والے (۷) کالجس ہیں لیکن یونیورسٹی ۱۷ ملحقہ سرکاری وخانگی ڈگری کالجوں میں تعلیم کی نگرانی تدریسی پالیسی کے تعین اور امتحانات کے انعقاد کی ذمہ داریوں کی تکمیل کر رہی ہے اور اسکے اسٹاف کے ارکان کی تعداد ۴ ہزار تک پہونچ گئی ہے ۔

یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں علاقہ تلنگانہ کے تمام ڈگری کالج رہے ہیں حال ہی میں تین اضلاع ورنگل ' عادل آباد ' اور کھمم میں واقع ڈگری کالجوں کو ورنگل میں واقع کاکتیہ یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا ہے ۔

آج یونیورسٹی سے وابستہ انڈر گریجویٹس کی تعداد ۸۵ ہزار ہے جن میں ۲۵ ہزار طالبات ہیں ۴ ہزار پوسٹ گریجوئیٹس ہیں ۲۵ فیصد طالبات شامل ہیں ۱۰ ہزار سے زیادہ طلباء و طالبات نے اکسٹرنل امتحانات پر رجسٹریشن کرایا ہے ۔ ۲ ہزار ۵ سو طلباء کرسپانڈنس کورس سے استفادہ کر رہے ہیں ۔ گذشتہ ۲۰ سال کے دوران طلباء کی تعداد میں دو چند سے زائد اضافہ ہوا ہے ۔

اکٹوبر ۱۹۶۸ء میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی تقاریب کا افتتاح کیا تھا یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں شامل (۴۷) کالجوں میں (۴۳۵۲۴) طلباء و طالبات زیر تعلیم تھے ۔ (۶۰۰) ہمہ وقتی اساتذہ ۹۴ انڈر گریجویٹ اور ۴۶ پوسٹ گریجویٹ سطح کے مضامین کی تعلیم دے رہے تھے ۔ جون ۱۹۸۸ء میں منعقدہ کانوکیشن میں جو پوسٹ گریجویٹ ڈگریوں کی تقسیم کیلئے منعقد کیا گیا تھا ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران کورسس کی تکمیل کرنے والے طلباء و طالبات کو ڈگریاں عطا کی گئیں ۔ (۱۷۶) طلباء

وطالبات نے پی ایچ ڈی ۱۰۸ نے ایم فل ۱۴۲ ایم ایڈ (۱۷) ایل ایل ایم ۲ ایم ڈی ۲۲ ایم ڈی یونانی وایورویدک ۲۰ ایم سی بچے (۱۱۵) ایم ای۔ ایم ٹیک۔ ۵۱۹ ایم ایس سی (۱۰۲) ایم بی اے ۴۷، ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران گریجویشن کی تکمیل کرنے والوں کی تعداد بی اے میں ۲۸۳۵ بی ایس سی میں ۳۷۳۵ بی کام میں (۳۸۰۵) تھی اسطرح ایک سال میں صرف روایتی کورس کی تکمیل پر یونیورسٹی سے مجموعی طور پر تقریباً (۱۰) ہزار طلباء و طالبات گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کررہے ہیں۔

کیمپس میں واقع ادارے

بانی جامعہ نے شہر کے شور شرابے اور گرد وغبار سے دور اڈکمیٹ میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے ۱۶۰۰ ایکر آراضی عطا کی تھی۔ حیدرآباد وسکندرآباد کی غیر معمولی توسیع کے نتیجہ میں آج یہ کیمپس دونوں شہروں کے درمیان ایک گنجان آبادی کا علاقہ بن گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اپنے ابتدائی دور کے دوران وسیع وعریض رقبہ کے باعث کئی تعلیمی و ریسرچ اداروں کو فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دامن میں جگہ دی جس کے باعث کیمپس کا سارا ماحول تعلیمی اور ریسرچ کا ماحول بن گیا ہے۔ آج یہ ادارے خود یونیورسٹی کی ریسرچ سرگرمیوں میں بھی معاون ثابت ہورہے ہیں ان میں

سنٹرل انسٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجس، ریجنل ریسرچ لیباریٹریز،

نیشنل انسٹیوٹ آف نیوٹریشن، سنٹر فار سیلولر اینڈ مالیکولر بیالوجی نیشنل جیوفزیکل ریسرچ انسٹیوٹ، سروے آف انڈیا، امریکن اسٹیڈیز سنٹر، انسٹیوٹ آف پبلک انٹرپرائزز، ریجنل سنٹر فار انوائرنمنٹل اسٹیڈیز، اور دائرۃ المعارف العثمانیہ شامل ہیں۔

ان تمام اداروں کے وجود نے کیمپس کے ماحول کو خالص تعلیمی بنانے میں مدد دی ہے۔ قومی اور بین الاقوامی اہمیت کی خدمات انجام دینے والے ان اداروں نے یونیورسٹی کے طلباء کو پی ایچ ڈی کے لئے ریسرچ کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔

دائرۃ المعارف جس نے اپنی خدمات کے ایک سو سال مکمل کر لیے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے رسمی وابستگی کے ساتھ خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارہ کو انقاد زمانہ کا سامنا کرنا پڑا۔ آج اس کی مالی حالت خستہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ادارہ اگر عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک نہ ہوتا تو شاید اس کی انفرادیت کا تحفظ مشکل ہو جاتا ہے۔

ویژن آف عثمانیہ

گوشہ عثمانیہ (VISION OF OSMANIA) یونیورسٹی کے ابتدائی دور اور قیام جامعہ سے قبل ملک اور حیدرآباد دکن کے عام ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ بانی جامعہ سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کی صدی تقاریب کے موقع پر چند عثمانین خاص طور پر پرنس مکرم جاہ بہادر اس وقت کے وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر، جناب عابد علی خاں، جناب امجد علی خاں پروفیسر شمیم علیم مسز بی این لعل

لائبریرین کی کاوشوں کے نتیجہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری بلڈنگ کے ایک ہال میں اس گوشہ کو بانی جامعہ اور جامعہ کے ابتدائی دور سے متعلق بعض دستاویزات تصاویر ماڈلس وغیرہ کو اسطرح آراستہ کیا گیا ہے کہ سیاح جو عثمانیہ یونیورسٹی کی یکتائے زمانہ آرٹس کالج کی فن تعمیر کی شاہکار عمارت کو دیکھنے آئیں انھیں اس جامعہ کے قیام کے اسباب ومحرکات اسکی عظمت ماضی سے بھی روشناس کرایا جائے عثمانین کی نئی نسل اپنی مادر علمیہ کے اساسی دور کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہوسکے اور ماضی کے اس ورثہ کی پاسبانی کا ان میں شعور پیدا ہو خاص طور پر اس دور کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کی اعلیٰ قدریں نئی نسل کو متاثر کرسکیں۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے جو اس وقت گورنر آندھرا پردیش کے عہدہ پر فائز تھے بحیثیت چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اس گوشہ عثمانیہ کا افتتاح کیا۔ اور عظمت ماضی کی یادگار کے تحفظ کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

گوشہ عثمانیہ کے ہال میں داخل ہونے والوں کے لئے سب سے پہلے وہ قدیم ایمبلم (نشان امتیازی) مرکز نظر بن جاتا ہے جو مخمل پر زرکاری کا بھی بہترین نمونہ ہے ۲۶ راپریل ۱۹۱۷ء کو جاری کردہ فرمان قیام جامعہ عثمانیہ کے لئے ۲۸ راگسٹ ۱۹۱۸ء کو جاری کردہ جریدہ غیر معمولی' دالترجمہ کے قیام کے احکام اور اسکے مقاصد پر مبنی فرمان' مختلف زبانوں کی اہمیت وافادیت سے متعلق فرمان شاہی۔ یونیورسٹی کیمپس کا نقشہ آرٹس کالج کی عمارت کے سنگِ بنیاد کی تنصیب' تعمیر کے مختلف مراحل اور افتتاح کی تقریب کی تصاویر طلبا طالبات کو بانی جامعہ کی ہدایات اور طلبائے جامعہ کی قرارداد جس میں اس درسگاہ کے قیام کے مقاصد کی تکمیل کا عہد کیا گیا ہے پیش کیا گیا ہے۔

آرٹس کالج کے افتتاح کے موقع پر آصف سابع کی تقریر تاریخی اہمیت رکھتی ہے جس کا مکمل متن خوبصورت طریقہ پر پتھر پر کندہ کیا گیا ہے۔ بانی جامعہ کو ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں پیش کردہ سلطان العلوم کی ڈگری اور اس تقریب کے موقع پر طبع شدہ دعوت نامہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کو جامعہ کے دور اساسی کے عام ماحول کے بارے میں رہنمائی کرتا ہے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ مکتوب جو انہوں نے قیام جامعہ اور دارالترجمہ کی خدمات اور اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے تجربہ کی ستائش کرتے ہوئے آصف سابع کو لکھا ہے تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس کا مکمل متن بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے تمام چانسلرس وائس چانسلرس کی تصاویر اور انکے دور کی نشاندہی یونیورسٹی کی تاریخ کا جائزہ لینے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ثابت ہوسکتی ہے۔ گوشۂ عثمانیہ کے قیام کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ نظامس ٹرسٹ نے بھی عطیے دیئے' ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے اپنے ایک مشاعرہ کی ساری آمدنی اس گوشہ کے قیام اور اس کی توسیع کے لیے مہیا کی۔

عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن

عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن آج مختلف فلاحی خدمات میں مصروف ہے ۲۵ نومبر ۱۹۳۲ء میں اپنے قیام کے بعد سے سابق طلبائین عثمانیہ کی یہ انجمن مختلف کمیٹیوں کے قیام کے ذریعہ فلاحی خدمات میں مصروف ہے ان میں میونسپل کمیٹی پولیٹیکل کمیٹی اور اکنامک کمیٹی شامل ہے۔ ابتدائی دور میں حضور نظام آصف سابع اور سر اکبر حیدری جیسی شخصیتوں کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی۔ گورنر جنرل برٹش انڈیا لارڈ واویل اور سری راجگوپال چاری گورنر جنرل آزاد ہندوستان نے بھی اس ادارہ کی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد اور سری لال بہادر شاستری نے بھی اس اسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کی ستائش کی اس اسوسی ایشن کے محرکین میں مسٹر عبدالرحیم، نورالدین، رحمت اللہ نواب میر احمد علی خاں، نواب اکبر علی خاں، رائے شنکرجی شامل ہیں جنہوں نے خدمت کے پرخلوص جذبہ کے ساتھ اس اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۰ء کے دوران اسوسی ایشن نے بلدی انتخابات میں حصہ لیا اور اس سلسلہ میں قابل امیدواروں کو عوام کی بنیادی ضروریات کی تشکیل کرنے والے اس ادارہ کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے پر راغب کیا۔

اکنامک کمیٹی نے ریاست کی معاشی ترقی میں ہاتھ بٹانے کے مقصد سے معاشی سروے کئے اس کمیٹی نے ۱۹۳۸ء میں نمائش سوسائٹی تشکیل دی جس کے زیر اہتمام آج تک کامیاب نمائش کا انعقاد عمل میں آرہا ہے اور جسے سارے ملک میں نمایاں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس نمائش کے انعقاد کا

بنیادی مقصد مقامی اور قومی صنعتوں کو اپنی پیداوار سے عوام کو متعارف کرانا اور اسکی نکاسی کی راہیں ہموار کرنا اور سائنس اور ٹکنالوجی کے عصری طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے نئی نئی ایجادات کی حوصلہ افزائی کرنا تھا چنانچہ آج تک نمائش کے موقع پر ایجادات پر اور مختلف فنون میں نمایاں صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے والے فنکاروں کو انعامات و اعزازات عطا کیے جاتے ہیں۔ نمائش کی آمدنی سے ہونے والی آمدنی کو تعلیم کے فروغ میں استعمال کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ آج سوسائٹی کے تحت دو ڈگری کالجس برائے خواتین ایک ڈگری کالجس برائے طلبا دو پالی ٹکنیک۔۔ طلبا کا ایک ہائی اسکول شامل ہے ان اداروں پر اب تک ایک کروڑ روپے صرف کئے گئے اسوسی ایشن کوچنگ کلاسس کا بھی انتظام کررہی ہے اسوسی ایشن کے اداروں نے آرٹس سائنس کامرس کے ہزاروں گریجویٹ تیار کیے اور ہزارہا لڑکیوں کو مختلف فنون کی تربیت کے ذریعہ سماج میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے قابل بنایا گیا ہے۔ اسوسی ایشن کے زیر اہتمام اداروں میں ونیتا مہاودیالیہ کملا نہرو پالی ٹکنک شنکرجی میموریل ہائی اسکول سردار پٹیل کالج سکندرآباد لال بہادر کالج ورنگل وینکٹیشورہ کالج سوریاپیٹ سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف کامرس تارناکہ کستوربا کالج فار ویمنس سکندرآباد لکشمی نرسمہا سوامی کالج بھونگیر شامل ہیں۔ آج یہ اسوسی ایشن ۲۲ رکنی مینجنگ کمیٹی پر مشتمل ہے۔ مسٹر ایم مدن موہن صدر، ڈی رام کرشنا راؤ نائب صدر، کے سدرشن نائب صدر، ڈاکٹر اروند کور ٹکر (سکریٹری) پی ونت راؤ جائنٹ سکریٹری جے رام سنگھ اجائنٹ سکریٹری، بی مادھو ریڈی (خازن) ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے چانسلرس

نام	مدت
سر سید علی امام	۱۹۲۰ تا ۱۹۲۱
نواب فرید الملک بہادر	۱۹۲۲ تا ۱۹۲۳
نواب ولی الدولہ بہادر	۱۹۲۴ تا ۱۹۲۵
مہاراجہ سر کشن پرشاد	۱۹۲۶ تا ۱۹۳۷
نواب حیدر نواز جنگ بہادر	۱۹۳۷ تا ۱۹۴۱
کرنل نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر	۱۹۴۱ تا ۱۹۴۵
امین الملک سر مرزا محمد اسمٰعیل	۱۹۴۶ تا ۱۹۴۷
جناب میر لائق علی	۱۹۴۷ تا ۱۹۴۸
میجر جنرل جے این چودھری	۱۹۴۸ تا ۱۹۴۹
مسٹر ایم کے ویلوڈی	۱۹۴۹ تا ۱۹۵۲
مسٹر بورگل رام کرشنا راؤ (چیف منسٹر حیدرآباد)	۱۹۵۲ تا ۱۹۵۶
مسٹر نیلم سنجیوا ریڈی (چیف منسٹر آندھرا پردیش)	۱۹۵۶ تا ۱۹۵۹
بھیم سین سچر (گورنر)	۱۹۵۹ تا ۱۹۶۲
جنرل ایس ایم سری نگیش	۱۹۶۲ تا ۱۹۶۴
شری پٹم تھانو پلے	۱۹۶۴ تا ۱۹۶۸
شری کھنڈو بھائی ڈیسائی	۱۹۶۸ تا ۱۹۷۵
شری موہن لال سکھاڈیہ	

مسز جسٹس ادبل ریڈی

شریمتی شاردا مکرجی

مسٹر کے سی ابراہام

مسٹر رام لال

ڈاکٹر شنکر دیال شرما

شریمتی کمود بین جوشی

وائس چانسلرس عثمانیہ یونیورسٹی

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۰ء

نواب ولی الدولہ ———— ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۴ ، ۱۹۲۶ تا ۱۹۳۶

قاضی محمد حسین ———— ۱۹۳۶ تا ۱۹۴۴

نواب اعظم جنگ بہادر ———— ۱۹۴۴ تا ۱۹۴۵

نواب علی یاور جنگ ———— ۱۹۴۵ تا ۱۹۴۶

نواب اعظم جنگ یکم اپریل ۱۹۴۶ تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر ولی محمد ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۶ء تا ۲۰ر جون ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۳۱ر جون ۱۹۴۸ء تا ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء

نواب علی یاور جنگ ۱۹۴۸ء ۱۹۵۲ء

ڈاکٹر سید حسین یکم اپریل ۱۹۵۲ء تا ۳۱ر اگسٹ ۱۹۵۲ء

ڈاکٹر ایس بھگونتم ۱۹۵۲ تا ۱۹۵۷

پروفیسر ایس دورائے سوامی ۱۵ر مارچ ۱۹۵۷ء تا ۱۴ر نومبر ۱۹۵۷ء

ڈاکٹر ڈی ایس ریڈی	۱۹۵۷	تا	۱۹۶۹
پروفیسر آر ستیہ نارائنا	۱۹۶۹	تا	۱۹۷۲
مسٹر این نروتم ریڈی	۱۹۷۲	تا	۱۹۷۵
مسٹر جسٹس پی جگن موہن ریڈی	۱۹۷۵	تا	۱۹۷۷
پروفیسر جی رام ریڈی	۱۹۷۷	تا	۱۹۸۲
جناب ہاشم علی اختر	۱۹۸۲	تا	۱۹۸۵
پروفیسر ٹی نونیت راؤ	۱۹۸۵	تا	۱۹۸۸

قومی اور بین الاقوامی شخصیتوں کو اعزازی ڈگریاں

عثمانیہ یونیورسٹی نے ہر دور میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی ممتاز شخصیتوں کے اعتراف خدمات کے طور پر یونیورسٹی کے عام جلسہ تقسیم اسناد یا خصوصی طور پر منعقدہ اجتماع میں اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

یونیورسٹی کی پہلی اعزازی ڈگری نواب عماد الملک بہادر نے حاصل کی انھیں ۲۸ ستمبر ۱۹۲۵ء کو منعقدہ جلسہ تقسیم اسناد میں ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ یکم مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور سر محمد اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کی گئیں ۲۷ جنوری ۱۹۴۴ء کو سی راجگوپال چاری نے ۱۶ فروری ۱۹۴۷ء کو بلبل ہند سروجنی نائیڈو نے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نوبل انعام یافتہ مسٹر سی دی رامن کو ۱۶ فروری ۱۹۴۷ میں یونیورسٹی نے ڈگری عطا کی آزادی کے بعد کے دور میں

اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے والی قومی اور بین الاقوامی شخصیتوں میں جواہر لال نہرو (۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء) سردار ولبھ بھائی پٹیل ۲۶ فروری ۱۹۴۹ء ڈاکٹر راجندر پرشاد (۳۰ اگست ۱۹۵۱ء) ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن (۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء) شری کے ایم منشی (۱۹ جنوری ۱۹۵۴ء) کے وی کے کرشنا مینن۔ علی یاور جنگ بہادر ۴ نومبر (۱۹۵۶ء) ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۵ اکٹوبر ۱۹۶۸ء کو منعقدہ گولڈن جوبلی تقاریب کے موقع پر ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ اعزازی ڈگریاں حاصل کرنے والی بیرونی شخصیتوں میں رشید عبدالحمید کرامی وزیر اعظم لبنان ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء اردن کے شاہ حسین ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء فیلڈ مارشل عبدالسلام عارف صدر جمہوریہ عراق ۲۹ مارچ ۱۹۶۴ء شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی ۹ جنوری ۱۹۶۹ء شیخ ذکی یمنی وزیر تیل سعودی عرب ۹ فروری ۱۹۷۵ء اور عظیم مجاہد حریت فلسطینی قائد یاسر عرفات شامل ہیں۔

○

۱۹۳۹ء میں آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارت کا افتتاح کرنے کے بعد
حضور نظام کا خطاب

ویژن آف عثمانیہ

چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی ڈاکٹر شنکر دیال شرما گورنر آندھرا پردیش
نے اپریل ۱۹۸۵ء میں افتتاح کیا